کرن کرن اندھیرا



صباحت عاصم

کرن کرن اندھیرا

○

صباحت عاصم

○

پوسٹ بکس ۱۹۳۵ —— اسلام آباد

اہتمام

بزمِ علم و فن پاکستان

اشاعت = ۱۹۸۹ء

بذریعہ: واسطی (پرائیویٹ) لمیٹڈ۔ اسلام آباد

ناشر: نیرنگِ خیال پبلیکیشنز۔ ۸۔ پی ایم اے ہاؤس راولپنڈی
طابع: ایس۔ٹی پرنٹرز۔ گوالمنڈی راولپنڈی

کتابت: محمد شفیع چیمہ۔ گوالمنڈی راولپنڈی

قیمت

پاکستان — اسّی روپے

بیرونِ ملک

پانچ پونڈ — آٹھ ڈالر (امریکی)

اِنتساب

○

بہن فرزانہ اور بھائی التفات

کے نام

ترتیب

کرن کرن اندھیرا

کرن کرن میں تھا عاصم مزاج اندھیروں کا
سحر کی راہ میں شب کا پڑاؤ دیکھتا تھا

تعارفی حوالہ

میرے گھر میں شعر و شاعری کا چرچا معمول کی بات تھی۔ پس صباحت عاصم نے اپنے بچپن ہی سے جگر مراد آبادی، حفیظ جالندھری، احسان دانش، عبدالحمید عدم، عبدالعزیز فطرت، باقی صدیقی اور اُن کے بعد کی نسل کے شعرا احمد فراز اور محسن احسان تک کو بار بار دیکھا اور سُنا۔

پھر میرے زمانۂ ملازمت میں ہر جگہ بہت شاندار مشاعروں کا اہتمام روزمرّہ کی بات تھی۔ صباحت عاصم ان میں منتظم کی حیثیت سے سرگرم رہا۔ یوں چپکے چپکے اس کے اندر ایک ننھا منا شاعر پرورش پاتا رہا لیکن اُس نے اپنی تعلیم کے زمانے میں اُسے سر نہ اُٹھانے دیا۔

معمول کی تعلیم حاصل کر کے ڈاکٹری میں داخلہ لے لیا اور پھر انگلستان جانا ہو گیا۔ اس کتاب میں شامل جملہ کلام وہیں کے دورانِ قیام کہا گیا۔ میں نے اس میں کسی قسم کی قطع برید کی ہے نہ کوئی ترمیم و تحریف۔ وجہ صاف ظاہر ہے۔ صباحت عاصم ایک نئے لہجے کا شاعر ہے اور جدید حسیّات و محسوسات اسی فکر و خیال کا قدرتی عنصر ہے — یہ اندازِ شعر گوئی ہمارے نسبتاً کلاسیکی اسلوب سے مختلف ہے اور ہم سے آگے کی بات ہے۔

یہ مضامین اور موضوعات پاکستان کی جدید ترین نسل کے نظریوں اور رویّوں کے آئینہ دار ہیں۔ میں تو اس مسلکِ تنقید کا قائل ہوں کہ فنّی اعتبار کے علاوہ اس دور کے نوجوان شعراء کی سخن گوئی کو ہمیں اپنی عینک سے دیکھ کر رجعت پسندانہ رائے زنی کا تختۂ مشق نہیں بنانا چاہیے۔

صباحت عاصم، ایک بہن فرزانہ اور ایک بھائی التفات کے بعد

۱۹۵۷ء میں بمقام مردان پیدا ہوئے۔ والدہ کا نام راشدہ ہے۔ ابتدائی تعلیم سینٹ میری ہائی سکول اور کنٹونمنٹ پبلک کالج پشاور سے حاصل کی۔ پھر خیبر میڈیکل کالج سے ایم بی بی ایس کیا اور انگلستان چلے گئے۔ عرصہ پانچ سال سے وہاں مقیم ہیں۔ وہاں دو اعلیٰ امتحانات میں کامیاب ہو چکے ہیں۔ اب تیسرے امتحان کی تیاری میں مصروف ہیں جس کے بعد وہ پاکستان لوٹ آئیں گے۔

صباحت کی بہن فرزانہ واسطی کو بھی شعر گوئی کا شوق ہے لیکن وہ اس طرف سنجیدگی سے توجہ نہیں دے سکیں اور اپنے دو بچوں سحیٰ فر اور فرزند کی تربیت پر صحیح طور سے زیادہ دھیان دے رہی ہیں۔

صباحت عاصم زمانۂ طالب علمی کے دوستوں۔ خاور احمد، احمد نواز، مصطفیٰ کمال اور مراد۔ کے ساتھ بزمِ علم و فن پاکستان کی تقریبات میں ذوق شوق سے حصّہ لیتے تھے۔ خاور احمد اور احمد نواز کے خوبصورت شعری مجموعے چھپ چکے ہیں۔ صباحت عاصم کی اس کتاب کے ساتھ گویا نئے ادبِ سرحد کی تکون مکمّل ہو گئی ہے۔

میرے گھر پہ آراستہ ایک محفل میں مرحوم علی احمد تالپور نے صباحت عاصم کو اُن کی تازگیٔ فکر اور سلاستِ فن پہ بہت شاباش دی یہیں سے ان کا حوصلہ بڑھا اور فارغ التحصیل ہو کر وہ اس کی طرف سنجیدگی سے متوجہ ہوئے۔

ان کی تربیت میں میرے دیرینہ احباب ایوب محسن، شمیم حیدر اور محسن احسان کا بھی بہت بڑا حصّہ ہے۔

شوکت واسطی

اسلام آباد۔ جولائی ۱۹۸۹ء

پیش لفظ

○

شعر گوئی کا جو آغاز تھا
اک کھیل سا تھا
لاشعوری یعنی
وقت کے ساتھ مگر

میرا رویّہ بدلا
شعر سنجیدہ ہوئے
اَور لفظوں میں وضاحت آئی
فکر بے باک ہوئی
جو مرے گرد بھی حالات رہے
اُن کے حوالے لکھا
جو بھی جذبات مرے ساتھ رہے
اُن کے بہانے لکھا
مَیں نے چاہا کہ مَیں کمزوروں کی آواز بنوں
زیر دستوں کے لئے

رکرم خوردوں کے لئے
اس اُمید سے پابند الفاظ
بن سکیں اُن کی جو قسمت کے ستارے
لکھوں

○

مرے لفظوں کا کوئی رنگ نہیں
نہ کوئی دائیں نہ بائیں اِن کے
میرے اپنے مرے سچّے الفاظ
یہ مرے ذہن کی دل کی آواز
مَیں نے چاہا ہے رہیں نور فشاں
روشنی ساز رہیں
رد کریں تیرگیوں کے اسلوب
اور سچّائی کو رکھیں محبوب

○

یہ حقیقت ہے مرے شعر نہیں ہیں رنگیں
تذکرہ حسن و لطافت کا بہت ہی کم ہے
خود سے بھی مَیں نے کئی بار یہ پوچھا اکثر
یہ دمکتا ہوا سیّارۂ راحت عالم
کیوں ہے بیرونِ مدارِ افکار

میری تصنیف میں رنگینی کہاں سے آئے

جب سے کھولی ہے یہاں آنکھ تو بحران سا ہے
مَیں نے سڑکوں پہ سُلگتا ہُوا خُوں دیکھا ہے
ہاتھ پھیلائے ہوئے بھُوک کا مُنہ دیکھا ہے
کھیت دیکھے ہیں جہاں خُون پسینے کے عوض
کاشت ہوتی ہے سسکتی ہوئی اُمیدوں کی
میں نے دیکھے ہیں دفاتر جن میں
افسروں کی تو نشستیں ٹھنڈی
اور کلرکوں کے بدن پھُکتے ہیں
فیکٹریاں دیکھی ہیں ایسی جن میں
کچھ بھی بنتا نہیں، سب بلتا ہے
اور بازار میں آکر ہر چیز
اپنی قیمت سے سوا بکتی ہے
مَیں نے دیکھے ہیں پسِ گرد کچھ ایسے بچّے
جن کے چہرے سے ذرا دُھل جائیں تو مہتاب نما
آشکارا ہوئے کچھ ایسی ذہانت سے مزیّن اطفال
جن کو تعلیم میسّر ہو تو سقراط بھی کیا
کیا کہوں دیکھتا ہوں ایسی عبادت گاہیں
کذب و دشنام کا ہر روز جہاں درس ملے
جس جگہ ظلم کی تجدید عبادت کا اصول
ایک اِک سجدہ ہے
پابندِ امامِ افضل

اور میں سوچتا رہ جاتا ہوں
جانبِ حق سے ہمیں آیا تھا
یہ کرم سازِ پیامِ افضل
عورتیں رہ گئیں مردوں کی اجارہ ہو کر
اُن کی آواز نہ شنوائی کوئی
قتل جو کرتا ہے ہمشیر کی عزّت کے عوض
بالکونی پہ وُہی مرد خریدار بھی ہے
کیوں نہیں سوچتا کوئی آخر
یہ فقط جسم نہیں
سوچ ہے
عزم ہے
احساس ہے۔ انکار ہے
اِقرار بھی ہے

○

یہ اور ایسے ہی مسائل کتنے
ہیں مرے ذہن میں ہر وقت مقیم
کِس طرح اِن کو فراموش کروں
اور فراموش اگر کر بھی دوں
تو یہ احساس کہاں دفن کروں گا جا کر
مَیں نے لوگوں سے خیانت کی ہے

○

بدن میں خون کی ایسی ہے کچھ فراوانی
ہو دل میں جیسی بھی طاقت رہے گی طغیانی

خود اپنے آپ ہی میں چھپ چھپا کے بیٹھا ہوں
بکھر نہ جاؤں کہیں ہے یہی پریشانی

اُچٹ نہ لے کہیں بجلی نہ تیرگی ڈس لے
چلو گھروں کو چلیں شب بہت ہے طوفانی

کسی کے نام تھی خوشبو کسی کے ہاتھ لگی
ہوا گلوں کی تمنّائیں بھی نہ پہچانی

ہماری روح کا ہر انگ آشکارا ہے
لباسِ خاک سے چھپتی نہیں ہے عریانی

مرے خدا مرے گھر کا بنے گا کیا آخر
جو لوٹتے ہیں وہی کر رہے ہیں دربانی

جو اعتماد ترا بدگماں ہے خود عاصمؔ
کرے گا غیر ترے گھر کی کیوں نگہبانی

ہوا بھی تیز ہے آہِ شکستہ جاں کی طرح
کھڑے ہیں ہم بھی مگر عزمِ جاوداں کی طرح

تمہاری یاد ہیں کیوں احترامِ وقت لیے ہے
تمہاری یاد نہیں ساعتِ زیاں کی طرح

بدن میں جیسے لہو جذب ہو گیا سارا
دماغ سوکھ رہا ہے گُلِ خزاں کی طرح

ہوا چلے گی تو سوکھے ہوئے سبھی پتے
گریں گے ٹوٹ کے بے وصف حکمراں کی طرح

بچھڑ کے بھی تو مرے ساتھ تم نے رہنا ہے
کسی خیال کی صورت کسی گماں کی طرح

نصیبِ مفتیٔ کم فہم اذنِ گویائی
سبھی عقیدے ہیں مفلوج ہر زباں کی طرح

وہ روشنی کے پیمبر کہاں گئے عاصم
ہر ایک آنکھ ہے تیرہ مرے مکاں کی طرح

○

حالِ ماضی سے جُدا ہو کے پریشان سا ہے
وقت اس دَور میں کیوں بے سر و سامان سا ہے

ایک ہی بار برس لے یہ لہو کا بادل
یہ غلط بات کہ ہر روز ہی طوفان سا ہے

کتنے شاداب ارادوں سے بسایا لیکن
دل بدستور مرا آج بھی ویران سا ہے

سخت جانی مجھے ورثے میں ملی ہے مَیں نے
جب سے کھولی ہے یہاں آنکھ یہ بحران سا ہے

ہو گیا جیسے ہواؤں کا چلن مصنوعی
حبس ایسا ہے ہر اک آدمی بے جان سا ہے

زندگی جہدِ مسلسل ہے سراسر لیکن
یہ غنیمت ہے کہ آرام کا امکان سا ہے

آدمی ریت کے ذروں کی طرح ہیں عاصم
شہر بے مصرف و بیکار بیابان سا ہے

○

بھٹک رہی ہیں عجب سسکیاں ہواؤں میں
گھٹن بہت ہے، بدن تنگ ہیں قباؤں میں

قدم قدم پہ ستمگر طلب کریں سجدے
بکھر رہی ہے خدائی کئی خداؤں میں

اُبھر سکی نہ تری شکل ہی ہیولوں سے
مَیں دیکھتا ہی رہا بے سبب خلاؤں میں

کمال آپ کا یہ سب نہیں کہ شامل ہے
مرا بھی حُسنِ نظر آپ کی اداؤں میں

ہوئی ہیں قوتیں مصلوب اِس طرح اب کے
رہی نہ طاقتِ پرواز بھی دُعاؤں میں

کروں تو کیسے مَیں فہرستِ دُشمناں تیار
تمہارا نام بھی آتا ہے بے وفاؤں میں

مکان اُن کے ہی عاصمؔ بلندیوں پہ بنے
نہیں ہے جست کی طاقت بھی جن کے پاؤں میں

کتابِ دل کا تری انتساب باقی ہے
حقیقتوں سے الگ ایک خواب باقی ہے

وُہ عشق بھُول گئے جس کو تم اُسی کے لئے
ہمارے دل میں ابھی اضطراب باقی ہے

جہان کم تھا کہ دوزخ بھی اک بنا ڈالی
الٰہی کون سا ایسا عذاب باقی ہے

اگر سُناؤں حدیثِ جنوں تو چند الفاظ
لکھوں اگر تو یہ پُوری کتاب باقی ہے

ہمارے ساتھ تو چل تصفیہ ہوا تیرا
ٹھہر کہ تجھ سے ہمارا حساب باقی ہے

یہ بحث چھوڑیئے مجرم ہوں یا نہیں کیجے
جو رہ گیا ہے ستم جو عتاب باقی ہے

ہوا تمام سفر دشت کا مگر عاصم
لبوں پہ ریت نظر میں سراب باقی ہے

چراغ دفع کرے بھی جو تیرگی کیا ہے
جب آنکھ ہی نہیں امکانِ روشنی کیا ہے

بہار آئی تھی، آ کر چلی گئی ہو گی
چمن کا حال سناؤ کلی کلی کیا ہے

وہ بات مجھ سے جو منسوب ہو کے پھیلی تھی
سبھی سے پوچھتا پھرتا ہوں کچھ سنی کیا ہے

میں چاہتا تھا خوشی درد دے دیا تم نے
ذرا سی بات ہے جاناں یہ بات ہی کیا ہے

سنا ہے رات وہ پاگل بھی مر گیا آخر
جو سب سے پوچھتا پھرتا تھا زندگی کیا ہے

سکونِ شہر کا دشمن تو مر گیا عاصم
یہ شور اب جو بپا ہے گلی گلی کیا ہے

○

شل ہیں سب اجزا مرے سہمے ہوئے افکار ہیں
زندگی ہی میں نمایاں موت کے آثار ہیں

غم، خوشی، نفرت، محبّت زندگانی اور موت
داستاں ہے ایک، لیکن منتشر کردار ہیں

آج ہے اتنی فضا بوجھل کہ ٹوٹے ہیں بدن
آج ہی کی یہ خبر حالات سب ہموار ہیں

رسمِ حق گوئی وراثت میں جنہیں بخشی گئی
اُن کے لب کیوں اس طرح گویائی سے لاچار ہیں

ایک جانب غم ہے اپنے دوسری جانب خوشی
ہم تو اپنی شخصیت کے درمیاں دیوار ہیں

کچھ نہ کچھ لاغر ہے قسمت بھی ہمارے شہر کی
اور کچھ شاہوں کی دہشت سے بھی ہم بیمار ہیں

چھین لیں محرومیوں نے ہم سے عاصم قوّتیں
اب یہ جسم و جاں کے سارے سلسلے بیکار ہیں

○

ہر شخص کو ہے ذات سے اپنی فرار کیوں
کہیئے ہر اک وجود میں ہے انتشار کیوں

مَیں ہستی و فنا کی وہی داستان ہوں
دُہرا رہی ہے زیست مجھے بار بار کیوں

کمروں میں جھانک لیجئے گلدان دیکھیئے
پھر سوچئے گا کم ہے چمن میں بہار کیوں

بوئے نہیں ہیں دل میں کسی آرزو کے بیج
ہم بانجھ کونپلوں کا کریں بھی سنگھار کیوں

پہلے تو مَیں نے آپ ہی نوچا تھا اب کی بار
ناخن نہیں بڑھے تو بدن ہے فگار کیوں

جس میں کہیں بھی سخت کوئی مرحلہ نہ ہو
عاصم کریں وہ راہ بھلا اختیار کیوں

نہ جانے زندگی کا یہ سفر کس موڑ تک جائے
مسافر گر نہیں تھکتا تو شاید راہ تھک جائے

گہر سے بیش قیمت ہے نظر سے بڑھ کے بامعنی
وہ آنسو جو کسی کی آنکھ سے یکدم ڈھلک جائے

جہاں کے پیچ و خم انساں سے پوشیدہ نہیں ہوتے
شفق سے جو کرن پھوٹے وہ آنکھوں میں جھلک جائے

لہو کے چند قطرے زندگی کے واسطے بس ہیں
ہوا کے چند جھونکوں سے کوئی شعلہ بھڑک جائے

بنا کے خود فسانہ لوگ کیا باتیں سناتے ہیں
اگر یک لخت کوئی نام ہونٹوں پر اٹک جائے

فقیر شہر تک پہنچے نہ پہنچے کیا غرض اس سے
امیر شہر کے گھر تک مگر پختہ سڑک جائے

کسی کا ذہن کے پردے پہ عالم اس طرح آنا
کہ جیسے سائے کے پیچھے کوئی سایہ لپک جائے

○

کارواں بھٹکا ہوا کس راہ کو اپنائے گا
کس ستارے کو یہ اپنا رہنما ٹھہرائے گا

گر سمندر ساحلوں کی ریت لے جائے تمام
کس طرح پھر ڈوبنے والا کنارے آئے گا

عکس پانی میں لرزتا دیکھتا ہوں بیٹھ کر
اس سے بڑھ کر کون اپنا پیچ و خم سمجھائے گا

مٹ رہے ہیں ذہن سے ماضی کی یادوں کے نقوش
شہرِ تنہائی مرا ویران سا ہو جائے گا

بادلوں میں گر یونہی پڑتے رہے ہر دم شگاف
کون تپتی ریت میں سایہ بہم پہنچائے گا

اس قدر قصے کہاں سے لائے گی آخر حیات
وقت پھر اک دوزا افسانہ مرا دہرائے گا

رفتہ رفتہ مندمل ہو جائے گا تیرا خیال
رفتہ رفتہ دل کو جانِ جاں قرار آجائے گا

تیرے کانوں پر جمی ہے بے حسی کی سرد ریت
میرا ہر شکوہ سراب احساس سے ٹکرائے گا

جس نے سورج پر چھڑک دی ہے سیاہی دیکھنا
وہ بھی تاریکی سے عاصم ایک دن گھبرائے گا

زمینِ چشم پہ ایسی بہار آئی ہو
کلی کلی میں تری شکل جھلملائی ہو

میں حسنِ نگاہ سے لیتا ہوں اپنے دُکھ کی دوا
اُسی سے دل نے کہیں چوٹ بھی نہ کھائی ہو

فنا قبول مگر شرط ہے کہ لاش مری
عظیم لمحوں کی تاریخ نے اُٹھائی ہو

لگا ہے یوں مجھے منطق جنون کا جیسے
شعور و فکر کی منزل یہ انتہائی ہو

مرے وجود میں یا رب مجھے مکمّل کر
مَیں چاہتا ہُوں کہ مجھ میں بھی اِک خدائی ہو

کوئی بھی شہر میں پہچانتا نہ ہو مجھ کو
بس ایک صرف مری تجھ سے آشنائی ہو

بڑا سکون ہے زندانِ چشم میں عاصم
خدا کرے نہ کبھی اب مری رہائی ہو

سنّاٹا

شہر کے اندر سنّاٹا ہے
جیسے کسی ماتم کا منظر
سڑکیں ہیں ویران اکیلی
راتیں ہیں پُرہول اندھیری
لوگ گھروں میں بند ہیں سارے
سوئے ہوئے ہیں بخت کے مارے
غم سے ہیں آزاد
حد درجہ بے ہوش
عاصم مت کر شور
عاصم بس خاموش

فاصلے

میرے کمرے سے ذرا دور ہے کمرہ تیرا
آنا چاہوں تو فقط چند منٹ لگتے ہیں
درمیاں ایسی رکاوٹ بھی نہیں ہے کوئی
پاؤں مانندِ صبا نرم و سبک پڑتے ہیں

چند لمحوں کی مسافت پہ مگر جانِ مری
زندگی بھر کے لئے طنز نہ بن جائے کہیں
تیرا ماحول تجھے تیرگیٔ شب مانے
مجھ کو مجرم مری تہذیب نہ ٹھہرائے کہیں

مرے کمرے سے بہت دُور ہے کمرہ تیرا
ٹھیک چھبیس برس کی یہ مسافت ہو گی
اپنے ماضی کو بھلانے کا تہیہ ہو گا
اپنے ماحول کے رشتوں سے بغاوت ہو گی

کس میں ہمّت ہے جو گزری ہوئی جاں سے گزرے
اپنے گزرے ہوئے قدموں کے نشاں سے گزرے

○

ہمیں تو زخم لگا اُس میں بے وفائی کا ہے
تمام شہر میں چرچا جس آشنائی کا ہے

خدا کیا ہے یہاں خود کو بار ہا اُس نے
مرے خدا جو ثنا خواں تری خدائی کا ہے

اُنہیں نے ہم سے کئی بار منزلیں چھینیں
گمان جن پہ ابھی تک شکستہ پائی کا ہے

کلاہِ شہ میں وہاں پھول ٹانک دو بڑھ کر
جہاں جہاں بھی لہو کچھ مری کلائی کا ہے

کبھی جو گھر سے نکلتے تھے مُنہ چھپائے ہوئے
اُنہیں کو خبط بہت آج رونمائی کا ہے

بدن کے ساتھ مری سوچ بھی کرو آزاد
قبُول ورنہ نہیں حُکم یہ رہائی کا ہے

قبائے شاہ میں ہر اک نگینہ بیش بہا
جڑا ہے یوں جو مرصّع مری کمائی کا ہے

قدم قدم پہ خُدا جن کو دستیاب ہوئے
اُنہیں کو ناز بھی اب رُوح کی اکائی کا ہے

بفیضِ گمرہی عاصم رہا قریبِ خُدا
ثبوت جراَتِ انکار پارسائی کا ہے

ہر ایک سانس سے سینے میں گھاؤ لگتا ہے
فضا میں آج بھی کل سا تناؤ لگتا ہے

یہ ٹھیک ہے یہ سمندر ہے پُرسکون سا مگر
نہیں اِدھر کا جدھر کا بہاؤ لگتا ہے

موافقت ہی بنا اہلیت کی ہو جس میں
مجھے تو ڈھونگ وہ سارا چناؤ لگتا ہے

کچھ اور بڑھنے لگا نرخ زندگی کا مری
کچھ اور گھٹتا ہوا جاں کا بھاؤ لگتا ہے

میں جس سحر کے تقاضے سے جاگ اُٹھا اُس کا
کچھ اب بھی شب کے سفر میں پڑاؤ لگتا ہے

یہ بارشوں کی نہیں رُت اگر تو کیوں عاصم
ہوا میں ایسا نمی کا دباؤ لگتا ہے

○

بھڑکتی آگ کو ہاتھوں پہ ہم اُٹھالیں گے
جو یُوں ہُوا تو یُونہی روشنی کو پالیں گے

فلک سے رنگ نہ برسے تو پھر زمیں والے
متاعِ سرخیٔ خوں سے ہی گُل سجالیں گے

خیالِ اہلِ ہوس خام ہے کہ ہم مفلس
بدن کے مول پہ رُوحیں بھی بیچ ڈالیں گے

ہے آفتاب کی وحدت پہ اعتقاد جنہیں
وہ لوگ اپنی نظر کے دیئے بجھالیں گے

جو اپنے دل کے اندھیرے فرو نہیں کرتے
ہم اُن کی ذات سے کیا قرضۂ ضیا لیں گے

عجیب حبس ہے جسموں میں جان گھٹتی ہے
ہَوا نہیں ہے میسّر تو سانس کیا لیں گے

ہَوا کے زور کو توڑو تو بات ہے عاصمؔ
ہَوا کے رُخ پہ سفینے تو سب بڑھالیں گے

جو پھول تیز ہواؤں میں لائے جاتے ہیں
وہ اپنا بوجھ زمیں پر گرائے جاتے ہیں

کلاہِ شہ کی بلندی کو ناپنے کے لئے
عجیب رسم ہوئی سر جھکائے جاتے ہیں

ترے کرم سے تو کیا ہم کو ہے یہ فخر کہ ہم
ترے ہر ایک ستم سے نبھائے جاتے ہیں

جو تیرگی میں جلاتی ہے آنکھ خود جل کر
دمِ سحر وہ دیئے کیوں بجھائے جاتے ہیں

امیرِ شہر کے ہاتھوں میں پھول رکھنے کو
غریبِ شہر کے بچے سجائے جاتے ہیں

کہ تم کو میرے بغیر ایک پل قرار نہیں
مجھے بھی ایسے فسانے سنائے جاتے ہیں

کہاں رہیں گے وہ محفوظ آندھیوں سے کبھی
مکاں جو ریت سے عاصم بنائے جاتے ہیں

○

ہوا ہے یوں تو مرے شہر میں چراغاں بھی
کہو، ہوئی ہے کہیں اک نظر فروزاں بھی

دلوں کی راکھ میں اب خواہشیں کہاں باقی
گھروں کے ساتھ ہی سب جل گیا تھا ساماں بھی

ذرا یہ عشرتِ یاراں کا دن تو ڈھل جائے
پھر اُس کے بعد سجے گی شبِ غریباں بھی

ہے دُھوپ تیز سفر دشت کا خیال رہے
بچائیے گا ہر اک سایۂ گریزاں بھی

شجر اُگا تو ہے صحرا میں اپنی مرضی سے
رہے گا کیا وہ مگر بے نیازِ باراں بھی

ترا یقین بھی ہے اور نہیں بھی اس دل کو
ترے خیال سے خوش بھی ہے یہ پریشاں بھی

تری نگاہ میں عاصم کے ہر خیال کا عکس
اگر ہے وجہِ تبسّم تو وجہِ گریاں بھی

O

جو حسرتیں تھیں نگاہوں میں مسکرانے لگیں
اُسے مری شبِ تنہا کے دُکھ سنانے لگیں

تھے ناخدا بڑے گرداب آشنا جس کے
وہ کشتیاں تو ٹھکانے اسی بہانے لگیں

ملا نہ ہم کو خداؤں سے آبِ یزدانی
وہ تشنگی ہے کہ رُوحیں بھی بلبلانے لگیں

میانِ فصلِ خزاں پھول جب بکھرنے لگے
تو شاخ شاخ کو پھر تتلیاں سجانے لگیں

تمہارے بعد کسی چیز کی طلب کیسی
تمہارے ساتھ ہی سب خواہشیں ٹھکانے لگیں

زباں پہ کھلنے لگے ہیں حسین پھول الفاظ
نگاہیں آپ کے چہرے کو گنگنانے لگیں

مرے وجود میں عالم فریب ہے جب ہی
حقیقتیں بھی مجھے سر بسر فسانے لگیں

بیاں میں سوز بھی ہے آنکھ بھی ہے تر میری
رہی ہے بات مگر پھر بھی بے اثر میری

وہ ہمسفر ہے تو میں مستقل سفر میں رہوں
نہ ختم ہو کسی منزل پہ رہگذر میری

نفس نفس میں جلا جسم کے جہنم میں
مرے وجود میں تکمیل اب تو کر میری

وہ لوگ جن کو مری ہر خوشی عبادت تھی
میں غمزدہ ہوں تو لیتے نہیں خبر میری

میں دیکھتا ہوں مگر مستعار آنکھوں سے
کہ روشنی نہیں ہوتی ہے اپنے گھر میری

اُسے نہ دیکھوں تو رہتی ہے دل کو بے چینی
بھٹکتی رہتی ہیں آنکھیں اِدھر اُدھر میری

قبائے تیرگیٔ شب میں چھپ گئی عاصم
نظر نظر میں درخشاں تھی جو سحر میری

مفاہمت

یہ بھی شامل ہے اس بارِ احکام میں
ڈالنا مت خلل شہ کے آرام میں

دست بستہ رہو، جاں شکستہ رہو
سر خمیدہ رہو، دل دریدہ رہو
لفظ ناآشنا کم سماعت رہو
حاملِ چشمِ صد آبدیدہ رہو

تشنہ بختی کو حکمِ الٰہی کہو
فاقہ مستی کو منشورِ شاہی کہو
زیر دستی کو قانون کا نام دو
راہزن کو محافظ سپاہی کہو
جسم کے درد کو بے ضرر جان لو
رہو جاں بلب اور اُف مت کرو
کفر کو عقل کا دائرہ مان لو
کوئی کچھ بھی کہے جائے تف مت کرو

اُجرتِ محنتِ سخت کیا مانگنا
ہر پڑاؤ کو منزل نما ماننا
مفتیٔ کج نفس کو خدا جاننا
ہر اک ناروا کو روا ماننا

مُنکرِ حرمتِ جاں قحط ہوا
جس میں جستجوئے نفس مت کرو
لطفِ آزادیٔ جسم کیا دیکھنا
کاوشِ قتل، دار و قفس مت کرو

آسمانوں سے شکوے گلے کس لئے
جو بھی حالات ہوں صبر سے کام لو
شکر صد شکر کہتے رہو مستقل
محورِ جاں رکھو شہ کے احکام کو

پا گریزاں رہو شہرِ الزام میں
ہاں کمی کچھ تو آجائے کہرام میں

○

وہ دور خوب تھا کانٹوں پہ حق تو تھا اپنا
اس عہد میں تو چمن ہی نہیں رہا اپنا

تمام راہ کی دشواریاں اُٹھا کر بھی
ذرا سا کوچۂ منزل نہ ہو سکا اپنا

ہیں خستہ حال سبھی بادبان کیا ہو گا
بدل لیا جو ہواؤں نے رُخ ذرا اپنا

گرے تو گر کے ہوئے راہ آشنا یعنی
نئے ستم سے نیا حوصلہ بنا اپنا

تمام شہر سے تم نے کہانیاں کہہ لیں
کسی سے کہہ نہ سکے ہم ہی ماجرا اپنا

پہنچ ہی جائے گا پھر گردنِ ستمگر تک
معاً اُٹھا جو کبھی دستِ نارسا اپنا

قدم قدم پہ ملے مختلف خدا عاصمؔ
کسی کے سامنے بھی سر نہیں جھکا اپنا

کاوشیں خام رہیں چاک گریبانوں کی
سُوکھ جانے کو زمینیں ہیں گلستانوں کی

جب کوئی اور نیا شہر بساتے ہیں لوگ
پھیل جاتی ہیں حدیں اور بھی ویرانوں کی

ضعف اُس عہد میں طاقت کا نشاں ہوتا ہے
بھُوک جس دَور میں خوراک ہو انسانوں کی

رُوح سرشار ہے احساس عبادت سے مگر
ڈھونڈتا ہُوں مَیں تُجھے بھیڑ میں یزدانوں کی

رتجگے، اشک، چبھن دل کی زمانے غم کے
کیسی فہرست رہی ہے ترے احسانوں کی

گھر مرا کس طرح محفوظ رہے گا عاصمؔ
نیتیں ٹھیک نہیں ہیں مرے دربانوں کی

○

اُسے یقین نہیں مجھ کو اعتبار نہیں
تعلقات شکستہ ہیں پائیدار نہیں

خمر بلیتے ہیں صدا دے کے جاں کی دلسوزی
لبوں پہ نوحہ کناں آہ مستعار نہیں

وہ شخص جس کی رفاقت پہ ناز تھا مجھ کو
میں غمزدہ ہوں تو کیوں وہ بھی اشکبار نہیں

قبائے دینِ محبت ہے تار تار مگر
وفا پرست نظر کوئی سوگوار نہیں

عجیب ہے شہر کا دستورِ احتسابِ عمل
جو بارسوخ ہیں وہ زیرِ اختیار نہیں

روش روش پہ کہو پھول منتشر کیوں ہیں
چمن میں عام جو تحریکِ انتشار نہیں

نہ پھول ہاتھ لگے اور نہ خار ہی عاصم
بھری بہار ہے لیکن کہیں بہار نہیں

○

دل میں چبھن ہو درد کی لب پر فغاں نہ ہو
یوں بھی کسی کے ضبط کا اب امتحاں نہ ہو

سُنئے شگافِ جسم کے بھر لیجئے کہیں
اس حبسِ بیکراں میں ہوا کا زیاں نہ ہو

یہ کیا کہ چند لوگ رہیں زیرِ دستِ فیض
اور بیشتر سروں پہ کوئی آسماں نہ ہو

میں ڈر رہا تھا میری نگاہوں کے دائرے
پھیلے اگر تو مجھ سے کوئی بدگماں نہ ہو

دل ہی جفا پسند ہے جاناں یہ ہے خیال
یہ احترامِ رسمِ وفا رائیگاں نہ ہو

کر تو رہے ہو دل کے عوض جاں کا فیصلہ
عاصم محبتوں کا یہ سودا گراں نہ ہو

○

کرن کرن کبھی سورج شمار کیا کرتے
یہ تیرہ چشم سحر کا شکار کیا کرتے

لہو کا رنگ ہی جب دلکشی سے عاری تھا
لباسِ فکر بھلا زرنگار کیا کرتے

خزاں پرست، ہواؤں کے پُر جنے والے
کبھی عقیدتِ جشنِ بہار کیا کرتے

جو دائرے بھی تری چشمِ تر نے کھینچے تھے
وہ قلبِ کرب زدہ کا حصار کیا کرتے

بدن کے درد سے اعصاب ہو رہے تھے شل
سفر حیات کا ہم جاں فگار کیا کرتے

رہے ہیں لوگ جو منکر خود اپنی ہستی سے
خدا کی ذات پہ وہ اعتبار کیا کرتے

بدن کے رنگ سے منسوب چاہتیں عاصم
کسی سے پیار بھی بے اختیار کیا کرتے

ایسی بے وصف مرے گھر میں ضیائیں پھیلیں
جیسے کرنوں میں اندھیرے کی ردائیں پھیلیں

کیوں لگے ہم کو بہاروں میں چمن ویرانے
کیوں طبیعت کے گلستاں پہ خزائیں پھیلیں

جسم کیا روح بھی لگتی ہے برہنہ جیسے
یہ کس انداز کی جسموں پہ قبائیں پھیلیں

ہم نے ہی جل کے نگاہوں کو بنایا سورج
جب بھی اس شہر میں ظلمت کی فضائیں پھیلیں

کر چکے لوگ عقائد سے تعصب پیدا
اور مذاہب سے بھی نفرت کی وبائیں پھیلیں

یوں لگا جب ترے گیسو مرے چہرے پہ جھکے
جیسے جلتے ہوئے سورج پہ گھٹائیں پھیلیں

المیہ یہ ہے مری نسل کا عاصم جب سے
وا ہوئی آنکھ تو دیکھیں ہیں جفائیں پھیلیں

ہم بھی بدنام بفیضِ دلِ ناداں ہوں گے
یعنی افسردہ بنظر چاک گریباں ہوں گے

درد سے خوف ہو کیوں آس خوشی کی بیکار
مرحلے زیست کے ایسے کہیں آساں ہوں گے

مَیں تو ہُوں اپنی تمنّا سے پریشاں بیشک
آپ بھی اپنے رویّے پہ پشیماں ہوں گے

ڈھل ہی جائے گی اندھیرے کی کڑی دُھوپ کبھی
پھر چراغوں کی طرح جسم نمایاں ہوں گے

ٹوٹ ہی جائیں گے جاگی ہوئی راتوں کے طلسم
شہر اُجڑیں گے تو آباد بیاباں ہوں گے

آپ کی راہبری پر بھی تو ہو گی تنقید
ہم اگر آبلہ پا خاک بداماں ہوں گے

شاہ نے جشن کا اعلان کیا ہے عاصم
شہر کے لوگ سبھی آج ہراساں ہوں گے

نئے سال کی دُعا

میرے خُدا
اِس اگلے برس تو
مجھ کو اتنا حوصلہ دینا
جب بھی کبھی میں
اپنے اندر جھانک کے دیکھوں
اور رہے جب اپنی نظر پہچان کے مجھ کو
"مَیں ہُوں"
بس اُس لمحے
اِتنا ظرف عطا ہو مجھ کو
اپنے گرد بھٹکنے والے
اِنسانوں کو
دیکھ سکوں مَیں
اور بلند آواز میں خود سے
اِتنا کہوں مَیں
"یہ بھی تو ہیں"

دستور

ہم ایسے دستور ساز کب تھے
کہ اپنے گھر کے ہر ایک کمرے کو
روشنی کا
ہوائے تازہ کا
اور معطّر رُتوں کا اعلیٰ انتظام دیتے
ہر ایک کونے میں
عافیت کا اور امن کا
اہتمام کرتے
ہر ایک دیوار کو حفاظت کا عزم دیتے
ہر ایک در کو
کمالِ پوشیدگی سکھاتے
ہر ایک نل کو
ہنر عطا کرتے صاف شفاف پانیوں کا
ہر ایک چولہے کو
بھوک کی تلخیوں سے
حد درجہ دُور رکھتے
سبھی چھتوں کو
کشیدہ موسم سے

چشم پوشی کا شوق دیتے
تمام رستوں کو غیر مانوس
اور عداوت نواز قدموں پہ بند رکھتے
ہم ایسے دستور ساز کب تھے

ہم ایسے قانون ساز کب ہیں
کہ ایک دستور وہ بنائیں
جو رتبہ و حیثیت کو بالائے طاق رکھ دے
کلیدِ انصاف و عدل ٹھہرے

ہم ایسے قانون ساز کب ہیں.....

گریز

دیکھ یہ کھیل عجب وقت نے کھیلا ہم سے
اب ملاقات ہوئی بھی تو ہوئی ہے ایسے
تُو بھی مجبور رہے حالات سے اپنے اور میں
ایسا خاموش ہوں چاہت بھی خطا ہو جیسے

تجھ کو یہ دُکھ ہے بہت دیر ہوئی ملنے میں
اور مجھے خوف ہے یہ وقت گزر جائے گا
دِل ہوا تیری رفاقت سے کچھ ایسا مانوس
تجھ کو گر ساتھ نہ پایا تو کدھر جائے گا

جانتا ہوں تجھے اپنا نہیں کہنا اچھا
مانتا ہوں کہ تجھے غیر سمجھنا بہتر
وہ جو منزل کی طرف لے کے نہیں جاتے ہیں
ایسے رستوں کو تو ہوتا ہے بدلنا بہتر

پھول سے ہونٹ ترے اور ملائم باہیں
تیرے سمٹے ہوئے گیسو ترے پیارے رخسار
مجھ کو معلوم ترا حسن پرایا جاناں
مجھ کو تسلیم نہیں میں ترا کوئی حقدار

تُو کسی اور کے آنگن کی ہے خوشبو جاناں
دل مگر تجھ کو سدا پاس بُلانا چاہے
تیری ہستی ہے کسی اور سے منسوب مگر
میرا احساس تجھے اپنا بنانا چاہے

مَیں بھی مجبور ہوں کچھ زور نہیں ہے دل پر
خواہشوں کو تو کوئی قید نہیں کر سکتا۔
اپنے جذبات پہ کس شخص کو قابو ہو گا
کوئی احساس کبھی بے موت نہیں مر سکتا

پھر بھی میں سوچ رہا ہوں کہ وہ سارے جذبات
جن کو خود تیرے تبسّم نے مجھے سونپا ہے
ایک اک کر کے انہیں دل سے جھٹکتا جاؤں
گو یہ مشکل ہے مگر کچھ بھی تو ہو سکتا ہے

سب کی سب میری تمنّائیں ہیں شرمندہ سی
ان تمنّاؤں کو مفہوم نہیں مل سکتا
ریت میں بیج پڑا ہو کہیں بارش نہ سحاب
ایسے عالم میں کوئی پھول نہیں کھل سکتا

○

رہا ہے جو شہر میں مشہور گمرہی کے لئے
مصر ہیں آج سفر میں وہ رہبری کے لئے

رواں ہے وقت تو حالات نے بدلنا ہے
چلو یہ غم بھی اُٹھالیں کسی خوشی کے لئے

ہر شہرِ تیرہ نظر کو یہ خبر ہو جسمِ نور،
جنون جیسے ہے موجود بے بسی کے لئے

ہر ایک موڑ پہ سورج کھلا ہوا لیکن
بھٹک رہی ہے ہر اک آنکھ روشنی کے لئے

زباں پہ پہرے، نظر بند، سوچ پہ پہرے
یہ اہتمام فقط ایک آدمی کے لئے

جہاد صبر و تحمّل کا نام ہے عاصم
کسی کا خون نہیں درکار بندگی کے لئے

درونِ خانۂ زنداں کوئی فغاں نہ کرو
رہے گی عدل کی فریاد رائیگاں نہ کرو

گھروں میں جن کے نہیں ایک آستانۂ گل
انہیں محافظِ اجناسِ گلستاں نہ کرو

ہے دل تمازتِ اہلِ جمال کا خواہاں
کسی کی زلف کا بھی اس پہ سائباں نہ کرو

ہوئی ہوا جو کبھی مشتعل تو کیا ہوگا
ضعیف شاخ پہ تعمیرِ آشیاں نہ کرو

سنا ہے آج ہوئی ہے سزائے موت اُس کو
جو کہہ رہا تھا فساد اپنے درمیاں نہ کرو

یہ ایک چشمِ گلِ خوشنما کے حلقے ہیں
اُلجھ گئے ہو رہائی کا اب گماں نہ کرو

زبانِ چشم سمجھتا نہیں ہے جو عاصم
اُسے عدالتِ جاناں میں ترجماں نہ کرو

○

ہر اک قدم کو عطا کی ہے بے بسی کس نے
مسافروں کو سجھائی ہے گمرہی کس نے

عبادتوں کا یہ سودا ہے خواہشوں کے عوض
خلوصِ دل سے بھلا کی ہے بندگی کس نے

ہر ایک شخص تھا پابندِ چشمِ خوابیدہ
دیارِ شب میں اذانِ سحر یہ دی کس نے

فصیلِ قصرِ فروزاں تجھے تو ہے معلوم
گلی گلی میں سجائی ہے تیرگی کس نے

ہوس کدہ ہے جہاں شکوۂ جفا کیسا
بصد خلوص یہاں کی ہے دوستی کس نے

یہ کون جان کا صدقہ بٹورنے نکلا
ہر اک گلی میں کھڑی یوں صلیب کی کس نے

بھٹکتے قافلے عاصم سوال کرتے ہیں
سفر میں کی ہے بھلا اُن کی رہبری کس نے

○

ختم کر دیتے ہیں لیجے آج افسانے کو ہم
شمع کے پہلو میں دفناتے ہیں پروانے کو ہم

یہ نہیں ہے دیکھ کر آئے ہیں دوزخ یا بہشت
بندگی کرتے ہیں اپنے دل کے بہلانے کو ہم

پتھرّوں میں جان ڈالیں گے سروں کو پھوڑ کر
عزم یہ کر کے چلے ہیں آج بُتخانے کو ہم

شب ہوئی تو اُس شجر ہی کو الاؤ کر لیا
سائے میں بیٹھے تھے جس کے دن میں سستانے کو ہم

بحث کے دَوران خود ہم متفق اُس سے ہوئے
زعم میں اپنے گئے تھے اس کے سمجھانے کو ہم

دُھول اُڑتی چھوڑ کر چل دے گا آگے کارواں
اور رہ جائیں گے عاصمؔ ٹھوکریں کھانے کو ہم

چاند کے سائے مرے گھر میں اُٹھا لائی ہے
روشنی کی بھی اندھیروں سے شناسائی ہے

کھو گیا تیرے خیالات میں ایسا جاناں
جشن تنہائی میں ہے جشن میں تنہائی ہے

فکر بھی غیر ہوئی دل سے بھی ایمان گیا
ایک چھوٹی سی خطا کی یہ سزا پائی ہے

ہو گیا جیسے مکمّل مری ہستی کا خلا
یہ صدا لوٹ کے پھر اپنی طرف آئی ہے

میری تہذیب مجھے روک رہی ہے تجھ سے
تیرا ملنا بھی مرے واسطے رُسوائی ہے

اُس کو مشکل ہے مرا جاننا عاصمؔ مجھ میں
اُس کی آنکھوں سے زیادہ کہیں گہرائی ہے

○

اچھا ہوا ہے لوگ جو مانوسِ غم ہوئے
ایسے ہوئے خموش، صدائے الم ہوئے

کرتے ہیں وہ بیان حقیقت کے فلسفے
سوچوں میں جن کی صرف فسانے رقم ہوئے

چلتے سفر میں ہم نے ڈھکا آفتاب کو
منزل ملی تو سائے ہمارے قلم ہوئے

کرتے ہیں جو خوشی سے نیازِ ستم قبول
وہ لوگ بھی تو شاملِ اہلِ ستم ہوئے

کب ساتھ ہمسفر ہیں سفر میں بصد خلوص
یہ راہزن کے ڈر سے مرے ہمقدم ہوئے

بیٹھے تھے جس درخت کے سائے میں ہانپ کر
سورج ڈھلا تو اُس کے ثناخوان کم ہوئے

عاصمؔ یہ حق پرست کا انجام خیر ہو
حیرت نہیں جو کل کو سرِ دار ہم ہوئے

○

حیثیت مجھ کو مری یاد دلا دیتے ہیں
یار تحفے میں جو زرّین قبا دیتے ہیں

مجھے معلوم ہے جو زور ہے موجوں کا حضور
آپ ساحل پہ کھڑے ہو کے صدا دیتے ہیں

اُسے کہتے ہیں برا میری تسلّی کے لئے
لوگ نادان ہیں شعلوں کو ہوا دیتے ہیں

مَیں پشیمان نہیں بات کوئی سچ کہہ کر
دیجئے آپ مجھے جو بھی سزا دیتے ہیں

روشنی چھپ نہیں سکتی ہے چھپائے سے کبھی
فکر پر پہرے عبث لوگ بٹھا دیتے ہیں

خواب بن جائے گی یہ تلخ حقیقت اک دن
آپ اس دَرد کو بیکار دوا دیتے ہیں

ہم سے عاصم نہ ہُوا لوگ نہ جانے کیسے
بے جھجک سَر درِ جاناں پہ جُھکا دیتے ہیں

○

منعکس مہتاب سے ہو کر اِسے گہنا گئی
جو کرن سُورج سے پھُوٹی تھی اُسی کو کھا گئی

جس کی لہروں نے کئی بستے گھروں کو پی لیا
کیوں نہ خلقِ شہر کرنے خشک وہ دریا گئی

ہر شبِ تیرہ نظر کو ہو خبر جسمِ ضیا
کٹ گیا تھا رُوح لیکن روشنی پھیلا گئی

کاٹ کر پھینکا ہے گر ناسُور تو پھر یہ کہو
درد سے پُورے بدن پہ کپکپی کیوں چھا گئی

پھُول کو نوچا تو خوشبو ٹکڑیوں میں بانٹ کر
ہر مکاں کے صحن تک خود ہی ہَوا پہنچا گئی

پھر ہَوا یُوں ذہن کو تیرا خیال آنے لگا
پھر طبیعت جس طرح ہر چیز سے اُکتا گئی

کس قدر معصوم ہے عاصم یہ خلقِ بدنصیب
کاغذوں کی چھتریاں بارش میں لے کر آ گئی

○

غلط ہے شب سے ڈریں رتجگوں کی بات کریں
چلو سحر کو لہو دے کے ختم رات کریں

عجب تو یہ ہے نہیں جن سے آشنائی مری
وہی بیان بھی سب میری مشکلات کریں

سیاہ شب میں جسے چھپ کے موت نے گھیرا
سحر نواز اُسے رہبرِ حیات کریں

یہ فیصلہ ہے عدالت کی کارروائی سے
مری صفائی کے خارج سبھی نکات کریں

یہ چند لوگ فقط اپنی خواہشوں کے لئے
غلط ہے سلب ہزاروں کی خواہشات کریں

وقوع روز یہ اس عہد میں ہوئے عاصم
بیاں تم ہی کہو کتنے حادثات کریں

○

بکھرے ہوئے ہیں داغ لہُو کے مچان پر
شاید ستم ہوا ہے کسی بے زبان پر

آخر دمِ وداع ہوئے بیقرار اشک
کب سے لرز رہے تھے یہ قطرے چٹان پر

جو ابر میرے کھیت کو بارش نہ دے سکا
کیوں بجلیاں گرائے مرے سائبان پر

اک شاخِ بے ثمر پہ ثمر خواہ کچھ طیور
بیٹھے رہے کہ ہو گئے بوڑھے جوان پر

کھینچی تھی جب کمان ہی آنکھوں کو میچ کر
پھر کیا گِلا کہ تیر نہ بیٹھا نشان پر

اب اُس جگہ تو ایک گڑھا تیرگی کا ہے
سُورج چمک رہا تھا جہاں آسمان پر

عاصمؔ خزاں تو خشک فلک کی نیاز تھی
الزام آ گیا تھا مگر باغبان پر

دُعا

دُعا کا وقت ہے آؤ دُعا کریں مل کر
کہیں خدا سے ہمیں پھر خدا شناسی دے
وہ کبریائی عطا ہو ہر ایک سجدۂ شرک
بفیضِ جرأت انکار بے اساس رہے
وہ اعتماد عطا ہو ہر ایک دعوتِ کفر
بفیضِ جرأتِ ایمان وصفِ دل نہ بنے
نفس کشید کرے جو بھی خواہشِ معیوب
کمال ضبط سے بیرونِ التجا ٹھہرے
شعور و فکر کی وہ روشنی ملے ہم کو
ادا ہو سجدۂ نوری جبینِ خاکی سے
کہ ہم کو وحی رہے محترم محبّت کی
کہیں بھی شہر میں نفرت سے کوئی کام نہ ہو
ہو جھوٹ جیسا بھی رنگیں ہمیں عزیز نہ ہو
حقیقتوں کے پیمبر ہوں راہ بر اپنے
ضیائے صدق و صفا سے ہوں راستے روشن
کوئی بھی منزل کذب و ریا ہمیں نہ ملے
کہیں نہ بوئیں کوئی فصل بھوک کی ہرگز
کسی بھی جسم کا غربت سنگھار ہو نہ سکے

ہر ایک تیرہ نظر کو بصارتیں ہوں عطا
جو بے زباں ہیں انہیں اذنِ حق بیانی دے
وہ گمرہی ہو عطا پائے صد دریدہ کو
کہ منزلوں کی طرف اپنا ہر قدم بھٹکے
ہو احترامِ بدی سے معاشرہ آزاد
کمالِ عدل و تحفّظ ہر اک نفس کو ملے
عذابِ لمسِ خزاں سے ہوں بے خبر ہم لوگ
ہر اک گلی کے کنارے پہ گلستاں سجے
غرض خوشی کا تقدس کا کامرانی کا
ہر ایک گھر میں ہمیشہ یہاں قیام رہے

دُعا کا وقت ہے آؤ دُعا کریں مل کر
کہیں خدا سے کہ ماضی پہ ہم ہیں شرمندہ
سبھی خطاؤں کا اقرار ہے ہمیں یارب
دلوں میں اپنے بھی اچھائی ہے ابھی زندہ

بس ایک قوتِ بیباک پھر عطا کر دے
پھر اپنی حرمت و وحدت سے آشنا کر دے

زمین مایوس ہو گئی ہے

زمین مایوس ہو گئی ہے
کہ امن اور عافیت کی فصلیں تو آفتابِ ستم کی اس بیکراں تپش میں
سلگ سلگ کر
قدم قدم راکھ ہو گئی ہیں

زمین مایوس ہو گئی ہے
کہ امن کی فصل بونے والے کے
ہاتھ چھلنی ہیں
پاؤں زخمی ہیں
اور ہونٹوں پہ پپڑیاں ہیں
جو بیج بھی دستیاب ہیں اب
بس اُن کا حاصل تو
مرگ پرور
کمان، پیکاں
بنانے والی یہ زہرا گود لکڑیاں ہیں
زمین مایوس ہو گئی ہے

...

یہ ماں جو اپنے جوان بچوں کا
خون کر کر کے جذب
بے حال ہو گئی ہے
نہ جانے کتنے ہی خون آلود مردہ جسموں کو
اپنے سینے میں دفن کر کے
اُداس پامال ہو گئی ہے
سوال کرتی ہے اپنے بچّوں سے
کیا نہیں تم میں ایک ایسا
جو چاہتوں کا نظام لائے
نہیں کوئی امن کے صحیفوں کا لکھنے والا
نہیں کوئی ایک بھی پیمبر
حدیثِ اُلفت سُنانے والا
نہیں کوئی نورِ چشم
جو تیرگی کو پیغامِ رخصتی دے
نہیں ہے کیا کوئی ایک ایسا بدن
کہ جس کی تپش سے ہو جائے راکھ جل کر
فساد کی فصل

ندامتِ بے حجاب لیکن
کچھ اس قدر عام ہو گئی ہے
سوال سن کر بھی اپنی ماں کا

ہر ایک بیٹا، ہر ایک بیٹی
بڑی رعونت سے سر اُٹھا کر
کھڑا ہُوا ہے، کھڑی ہُوئی ہے
نظر گھُما کر
چلا گیا ہے، چلی گئی ہے

زمین مایوس ہو گئی ہے
اُداس نظروں سے دیکھتی ہے فلک کی جانب
سسکتے لفظوں میں ملتجی ہے
مرے خدا مجھ کو حوصلہ دے
کہ اپنے بچوّں کی کم نگاہی کا زخم سہہ لوں
مرے خُدا اِن کو روشنی دے
کہ میں بھی دو چار دن اندھیرے سے دور رہ لوں

○

تھی اپنے آپ میں آتش فشاں، ہوا کوئی
لگی تھی آگ کسی کو، مکاں جلا کوئی

چلے جو تھام کے کاندھے وہ فائدے میں رہے
کسی نے کھائی بھی ٹھوکر اگر گرا کوئی

یہ باغباں کے ہنر کا کمال تھا شاید
کسی کا بیج لگایا شجر اُگا کوئی

تمام جسم برہنہ لگے تھے جب نکلا
پہن کے بیش بہا خوشنما قبا کوئی

اب اس سے بڑھ کے بھی معیارِ عدل کیا ہوگا
کسی کے جرم کی پانے لگا سزا کوئی

نہیں ہے نغمۂ ہستی تو سازِ مرگ سہی
میانِ شہرِ خموشاں اُٹھے صدا کوئی

بنا ہے میری تمازت سے آب ابر مگر
مرے ہی کھیت پہ برسی نہیں گھٹا کوئی

وہ مجھ کو مار کے اندر سے ٹوٹ پھوٹ گیا
کوئی مرا تھا مگر دفن ہو گیا کوئی

انہیں کے جسم پہ عاصم تھے بیشمار نشاں
قبا پہ جن کی نہ تھا داغ بدنما کوئی

نہیں کہ آئے فقط اک بلند گھر میں کرن
سحر تو وہ ہے جو بھر دے نظر نظر میں کرن

ستم ظریفیٔ قسمت وہ لٹ گئے دن میں
جو شب کے خوف سے لے کر چلے سفر میں کرن

کشادہ چشم رہے تیرگی زدہ لیکن
بھری ہوئی تھی ہر اک چشمِ مختصر میں کرن

خدائے نور مرے گھر میں بھیج دے سورج
کہ تیرگی ہے بہت اور کم اثر میں کرن

میں دیکھ ہی نہ سکا تھا وداع کا منظر
بکھر کے ٹوٹ رہی تھی نگاہِ تر میں کرن

عجب نہیں وہ اگر آفتاب گُل کر دیں
جنہیں نہ آئی میسر کسی سحر میں کرن

چراغِ عدل ہی جب بجھ گیا ہے پھر عاصم
پہنچ سکے گی کہاں جرم کے نگر میں کرن

شکستہ پائی سے بچ کر مری نکل بھی گیا
جو راہ پر تھا مرا راستہ بدل بھی گیا

کروں گا کیا جو ہوئی پھر بھی آتشیں بارش
جو سائباں تھا مرے سر پہ وہ تو جل بھی گیا

ہوا شدید ہے اتنی یہ جھونپڑے ہی نہیں
امیرِ شہر ترا خوشنما محل بھی گیا

کمان کھینچنے والا ہدف شناس نہ تھا
شکار زد میں نہیں تھا کہ تیر چل بھی گیا

مَیں سوچتا ہی رہا راستے ہیں پیچیدہ
جو میرے ساتھ چلا تھا کہیں نکل بھی گیا

جو تیرنا ہی نہیں جانتا وہ ڈوبے گا
ذرا سی دیر کو کیا ہے اگر سنبھل بھی گیا

بڑا ہی بپھرا ہوا دستِ شاہ ہے عاصمؔ
بچاؤ رُوح وہ جسموں کو تو کچل بھی گیا

○

مری زباں کو ہر فکر تک رسائی دے
مرے خدا مجھے اندازِ کبریائی دے

میں چپ رہوں تو مرے جسم کا خلا گونجے
جو کچھ کہوں تو ہر اک حکم بے نوائی دے

یہ شہر کم نظراں ہے مگر یہیں مجھ کو
ہر ایک جسم پہ زرّیں قبا دکھائی دے

میں جس کے واسطے پہچان اپنی بھول گیا
وہی نگاہ مجھے داغِ بے وفائی دے

نہیں کلائی کا یہ مسئلہ ہے گردن کا
کٹے تو کشمکشِ رزق سے رہائی دے

تمام شہر ہے خاموش اس طرح عاصم
ہر ایک چہرہ مجھے بولتا سنائی دے

○

سارے گلشن میں کہیں پتہ ہرا کوئی نہ تھا
فصلِ گل میں بھی مقامِ خوشنما کوئی نہ تھا

قید تھے مجبوریوں کے جال میں سب ہمسفر
ورنہ میرے کارواں میں بے وفا کوئی نہ تھا

شہرِ نو کے تھے نئے منظر نئی تعمیر تھی
ہاں مگر چہرہ شگفتہ اور نیا کوئی نہ تھا

ہر بدن بے چین تھا لیکن ہر اک لب تھا خموش
شہرِ پُر آشوب میں اہلِ صدا کوئی نہ تھا

دیکھنے میں ایک بھی چہرہ نہیں تھا پُر امید
اور کہنے کو وہاں بے آسرا کوئی نہ تھا

کیا عجب قصہ تھا یہ اہلِ نظر کے شہر میں
عین شب میں بھی کہیں روشن دیا کوئی نہ تھا

بیٹیاں حوا کی عاصم گرچہ زندانوں میں تھیں
شاہ سے آدم کے بیٹوں کو گلا کوئی نہ تھا

O

یہ لوگ کیسے مجھے روشنی دکھانے لگے
کہ درمیان میں خود ان کے سائے آنے لگے

بڑا عجیب ہے قانون یہ مرے گھر کا
جُھکے نہ جو وہ کسی ڈھنگ سے ٹھکانے لگے

عجیب لوگ ہیں یہ اپنے نم زدہ ملبوس
پگھل کے سطح پہ دریاؤں کی سکھلانے لگے

میں سوچتا ہوں کبھی وقت وہ بھی آئے گا
میں اُس کے پاس نہ جاؤں تو وہ بُلانے لگے

جُھلستی دُھوپ میں جس پیڑ نے دیا سایہ
ہوئی جو شب تو اُسے ہمسفر جلانے لگے

گھروں میں برف کے جو لوگ ہیں مقیم وہی
بڑا عجیب ہے سورج کو آزمانے لگے

جو لکڑیوں کے مکانوں میں قید ہیں عاصم
وہ روشنی کے لئے آگ کیوں جلانے لگے

جو عشق درد ہے اس کو وفائیں دینے لگا
میں دل کی آگ کو خود ہی ہوائیں دینے لگا

گناہ کی طرح محتاط ہے ستم پرور
لگا کے زخم بدن کو قبائیں دینے لگا

اُسی کو سب نے بالآخر کیا خدا تسلیم
جو نیکیوں کے عوض بھی سزائیں دینے لگا

میں جس کے قتل کا مجرم ہوں وقتِ مرگ وہی
طویل عمر کی مجھ کو دعائیں دینے لگا

وہ شہرِ اہلِ سماعت نہیں تھا جس میں کہ میں
جوانِ شب میں سحر کو صدائیں دینے لگا

یہ لہلہاتا ہُوا کھیت جس کو سونپا تھا
ہمیں وہ زہر سے بھر کر غذائیں دینے لگا

مری زمین کے جب بیج جل گئے سارے
تو پھر خدا بھی مجھے عاصم گھٹائیں دینے لگا

○

حقیقتوں کے عذاب دیکھوں کہ خواب دیکھوں
جُھلستے صحرا کی ریت پرکھوں سراب دیکھوں

تمہاری تحریکِ چشم اتنی نہ پھیل جائے
مَیں اپنے دل کے نگر میں اک انقلاب دیکھوں

زمیں کے وحشت بدست لوگوں کے ڈر سے ٹھہرے
کٹے پتنگ اب فضاؤں میں بے حساب دیکھوں

اُنہیں کے پاؤں قدم قدم پر اُلجھ رہے ہیں
کھُلا ہوا جن کی آنکھ میں آفتاب دیکھوں

تمہارے اندر کی بدنما ٹوٹ پھوٹ جانچوں
کہ صاف چہرے کی ظاہری آب و تاب دیکھوں

ہے زندگی کا جواز تحریکِ ناتمامی
مَیں راہ کو منزلوں پہ کیوں کامیاب دیکھوں

کسی بھی چہرے پہ مُسکراہٹ نہیں ہے عاصم
مگر ہر اک ہاتھ میں شگفتہ گلاب دیکھوں

تحریکیں قتل نہیں ہوتیں

تاریخ کے پڑھنے والوں کو
معلوم ہے یہ
کوئی بھی ستم، کیسا ہی کڑا ——
دو چار گھڑی —— کچھ گھنٹے ہی
کچھ روز، مہینہ، چند برس
چلتی ہوئی تحریکوں کا عمل
روکے بھی اگر
تو بے معنی
تحریکیں قتل نہیں ہوتیں
تحریک چلانے والوں کے جسموں کا لہو
وہ ایندھن ہے
جو لمحہ لمحہ جل جل کے
ہر پست و شکستہ حوصلے کو
اک آگ فراہم کرتا ہے
تحریکیں زندہ رکھتا ہے
—— تحریکیں قتل نہیں ہوتیں

○

رہِ صلیب سے گزرے وہی ستارے تھے
کہ جن کے نور میں صبحوں کے استعارے تھے

اُس ایک چشمِ گلِ خوشنما کے حلقوں میں
ہزار طرز کے بے ساختہ اشارے تھے

ادھر یہ حال کہ قحط ہوا تھا اور ادھر
ہر ایک ہاتھ میں پھولے ہوئے غبارے تھے

میں ڈوبنے سے جو بچتا تو کس طرح آخر
میانِ حلقۂ گرداب سب کنارے تھے

لگا نہ اُس پہ مگر پھر بھی داغِ عُریانی
بدن سے جس کے کئی پیرہن اُتارے تھے

گلِ اُمید سے کونپل کوئی نہیں پھوٹی
اگرچہ دل کے ارادے نہیں کنوارے تھے

ہوا کو حُسن شناسی کا فن بھی آتا ہے
جو گل چُرائے چمن سے وہ کتنے پیارے تھے

ہوا بھی ایسی چلی شہرِ چشم میں عاصم
بھڑک کے آگ بنے دل میں جو شرارے تھے

یہ کیا کہ دل میں بُتِ ظرفِ پُرریا رکھنا
مگر جبیں پہ سجائے ہوئے خدا رکھنا

گھُٹن سے تنگ زمیں پی نہ لے ہوا ساری
بدن میں ایک ذخیرہ کہیں چھُپا رکھنا

بڑا عجیب ہے ترکِ تعلقات کے بعد
تمہارا مجھ سے کسی طرح نہ کا گِلا رکھنا

لگی ہیں جسم میں لوہے کی ہڈیاں ساری
لگے نہ زنگ خیالِ نم ہوا رکھنا

یہ کیا کہ اُس کے بنا ہو گئے ہو تم تنہا
یہ کیا کہ شہر میں بس ایک آشنا رکھنا

یہ حکم اہلِ عبادت ہمیں ملا اب کے
خدا کے سامنے پتھر کا دیوتا رکھنا

لپٹ رہی ہیں وہ چڑیاں ہی شاخ سے جن کو
ہوا میں آتا توازن نہیں ذرا رکھنا

ہو دل میں درد تو چہروں کو اعتماد میں لو
بدن کے داغ قباؤں پہ مت سجا رکھنا

غلط ہے جسم پہ عاصم رکھو توانا پر
مگر نگاہ میں محدود سی فضا رکھنا

تہذیب

یہ مغرب ہے
یہاں تہذیب ہے
تعلیم ہے
اخلاق ہے
اِنسان میں اِنسانیت ہے
یہاں اِنساں کی قیمت ہے
تمدّن ہے
ثقافت ہے
سکوں ہے
امن ہے
اور عافیت ہے

یہ مشرق ہے
یہاں تہذیب کم
تعلیم کم

اِخلاق گم
تمدّن گمُ
ثقافت گمُ
سکوں غائب
نہیں اِنسان میں انسانیت باقی کوئی
یہاں اِنسان کی قیمت نہیں ہے
ہر اک جانب بپا ہے
قتل و غارت
غضب ہے
جنگ ہے
اُس پر مکمّل بے حسی ہے
مَیں خود بھی مشرقی ہوں
اور مجھے اس پر ندامت ہے
مگر اس فکرِ شرمندہ کو پھر بھی
جسارت ہے
کہ مَیں یہ سوچتا ہوں
یہ سب نازیبا اور مکروہ ہتھیار
جو میرے سبزہ زاروں کو
جو میرے ریگزاروں کو
دُھوئیں کی

خوُن کی
قبروں کی
اور مکروہ چیخوں کی
جو اس سوغات دیتے ہیں
وہ سب مغرب میں بنتے ہیں
میں اپنے آپ سے حیران ہو کر اتنا کہتا ہوں
کہ مغرب تو مہذّب ہے

بے گناہی کے لئے موجود ہر تعزیر تھی
ہاں مگر منصف کے لب پہ عدل کی تقریر تھی

گھس گئیں دیوار کی اینٹیں تو مطلب کھو گیا
کیوں چٹانوں پہ نہ کندہ شہر کی تقدیر تھی

اک عمارت بھی نہیں تھی شہرِ نو میں خوشنما
ہر کھنڈر سے آشکارا حسرتِ تعمیر تھی

اس قدر احساسِ ہستی تھا گراں اس دور میں
ہر دوائے زندگی میں زہر کی تاثیر تھی

حکمِ آزادی کا پرچہ شاہ سے لایا تھا جو
پاؤں میں اُس شخص کے باریک سی زنجیر تھی

وقفِ بہبودِ خلائق جو بھی فرمائی گئی
ضبط بھی سرکار کے حق میں وہی جاگیر تھی

مسجدِ دل کی امامت مل گئی عاصمؔ مجھے
میرے ہونٹوں پر محبت کی جو اک تکبیر تھی

حقیقتوں سے ہیں خائف صداقتیں کتنی
ہیں زندگی میں ہماری اضافتیں کتنی

بچا ہے ایک یہ پیمانۂ ہوا گویا
شمار کیجئے سر پہ گری چھتیں کتنی

محل سرا میں صلیبوں کا کارخانہ لگا
نہ جانے شہر میں ہوں گی ہلاکتیں کتنی

تمہارے بن تو گزرتی نہ تھیں تمہارے ساتھ
گزر گئی ہیں گھڑی بھر میں ساعتیں کتنی

تجھے خبر ہے تری ایک دوستی کے لئے
نبھائیں شہر میں مَیں نے عداوتیں کتنی

یہاں تو روز ہے ہنگامۂ ستم عالم
کوئی کرے تو کرے بھی شکائتیں کتنی

○

یہ رنگ و بُو کا مکاں درد کے حصار میں ہے
مرا لہُو بھی نمایاں تری بہار میں ہے

وہ راہرو جو زمیں سے اُلجھ اُلجھ کے چلا
پہنچ گیا سرِ منزل مگر غُبار میں ہے

میں تیرے بعد بھی تیرا خیال رکھتا ہوں
کشش عجیب سی اس کربِ پائیدار میں ہے

کسی خلش نہ تمنّا کا اعتبار ہے کچھ
یہ شہرِ اہلِ محبّت تو انتشار میں ہے

وہ شخص جس نے مرے سر سے پختہ چھت لے لی
یہ سائباں بھی مرا اُس کے اختیار میں ہے

پھر اُس کے بعد ہوا یُوں کبھی ملے ہی نہیں
پھر اُس کے بعد سے دل تیرے انتظار میں ہے

تُو مجھ سے ہو کے جُدا تازگی نہ کھو بیٹھے
کہ تیرا حُسن مرے عشق کے مدار میں ہے

مَیں جس کو چھوڑ کے آیا ہیں جس کے ساتھ چلا
سُنا ہے قافلہ وہ اب بھی رہگذار میں ہے

مری قبا کا ہر اک تار خوشنما عاصم
بنا ہوا کہیں دستارِ شہریار میں ہے

یہ کیا عجب ہے محبت کے یوں اوائل ہوں
تمہارے اور مرے اور کچھ مسائل ہوں

کبھی جنہیں مری خوشیوں سے اتفاق نہ تھا
وہ لوگ کیوں مری محرومیوں میں حائل ہوں

اُنہیں کا خوف ہے مجھ کو اُنہیں سے پیار بھی ہے
وہ لوگ جو مری مجبوریوں کے قائل ہوں

اُنہیں بھی دیکھ نہیں جن کا آسرا کوئی
تو اُن کی فکر نہ کر جن کے کچھ وسائل ہوں

سفر دراز بھی ہو، رہگذار سخت بھی ہو
اور اس پہ یہ کہ مسافر کے پاؤں گھائل ہوں

تمام لوگ جہاں شر مزاج ہیں عاصم
عجب نہیں ہے جو اُس شہر میں بھی سائل ہوں

شجر حسین تھا معصوم سی گلہری تھی
ادھر نگاہ میں گلچیں کی سوچ گہری تھی

وہ کٹ چکی تو کسی بھوک میں نہیں چمکی
کھڑی ہوئی تھی تو وہ فصل کیا سنہری تھی

ہر ایک شخص کو آنے لگا تھا موت پہ رشک
عجب مقام پہ آکر حیات ٹھہری تھی

سمجھتے کیا، وہ جو سُنتے تھے گفتگو سب کی
بفیضِ حسنِ سماعت یہ خلق بہری تھی

جہاں تمیز نہ منصف کی تھی نہ مجرم کی
قدم قدم پہ اُسی شہر میں کچہری تھی

وہ تھک چکے تو زمینوں پہ سو گئے عاصمؔ
جنہوں نے سر پہ رکھی شاہ کی مسہری تھی

○

آئے کیا کیا نہ مجھے درد سنانے میرے
کتنے ہی لوگ ملے تجھ سے بہانے میرے

ہاتھ لرزے تھے کہ منظر نے جگہ بدلی تھی
دُور بیٹھے تھے نشانوں سے نشانے میرے

ہاں ترے بعد نہیں دل میں رہا ٹھہراؤ
ورنہ کب پہلے بدلتے تھے ٹھکانے میرے

تُجھے کھویا ہے تو کیا اور خُدا سے مانگوں
حوصلے توڑ دیئے ایک دُعا نے میرے

وہ مجھے چھوڑ کے اِس بار چلی جائے گی
خاک ہو جائیں گے سب خواب سہانے میرے

مَیں تجھے تیری طرح چھوڑ کے جا سکتا تھا
پاؤں زنجیر کئے میری اَنا نے میرے

اپنی شہرت کا اُسے شوق ہے عاصم جب ہی
جس کو ملتا ہے سُناتا ہے فسانے میرے

آپ کا چہرہ مرے خوابوں کی بینائی میں تھا
حسن کتنا دل نشیں راتوں کی تنہائی میں تھا

ڈھونڈنے والوں نے پر کھا صرف لہروں کا سکوت
ڈوبنے والا کبھی کا غرق گہرائی میں تھا

تتلیوں نے رنگ پھیلائے تھے لیکن ساتھ ساتھ
خوشبوؤں کا ہاتھ بھی پھولوں کی رسوائی میں تھا

جسم کو سکتہ رہا جب تک مجھے آرام تھا
درد کا کیسا شدید احساس انگڑائی میں تھا

روز ہی ملتے تھے لیکن بات کچھ ہوتی نہ تھی
رنگ کیسا ناشناسی کا شناسائی میں تھا

تشنگی میں کس طرح کرتا سراب جاں کشید
تجربہ ایسا کہاں اب دشت پیمائی میں تھا

تھی شراب نور گر عاصم اندھیروں پہ حرام
کیوں سحر کا رنگ پیدا شب کی رعنائی میں تھا

○

بس اب کی بار خموشی کی انتہا بولے
بڑھے سکوت کچھ اتنا کہ خود خدا بولے

غلط ہے پوچھنا لوگوں سے داستانِ ستم
زباں پہ مہر لگی ہو تو کوئی کیا بولے

بندھیں گے بند کہاں آندھیوں کی لہروں پہ
کواڑ کھول دو ایسا نہ ہو، ہوا بولے

جو ایک گھر کے مسائل سنانے آئے تھے
وہ شہر یار کے آگے جدا جدا بولے

صدائے پا ہے تری تو نہیں قریب مگر
فلک پہ ابر نہیں ہے مگر گھٹا بولے

کسی کو ربط نہیں ہے فنِ سماعت سے
یہ حال ہو تو کوئی کس قدر بھلا بولے

وہ مجھ سے بات کرے جب تو یوں لگے عاصم
کہ آشنا سے کوئی غیر آشنا بولے

کہاں ملے گا بہاروں کو پیرہن کوئی
رہا ہے شہر میں سرسبز بھی چمن کوئی

دیارِ غیر میں کس درجہ پیارا لگتا ہے
جو اتفاق سے مل جائے ہموطن کوئی

میں اعتراف کروں اپنے ٹوٹ جانے کا
کہیں دکھائی تو دے مجھ کو پختہ تن کوئی

رہوں حقیر نہ میں جس میں تو عظیم نہ ہو
جو حوصلہ ہے سجا ایسی انجمن کوئی

مزہ تو یہ تھا ملا جب بھی اذنِ حق گوئی
نہیں تھا شہر میں وابستۂ سخن کوئی

سفر دراز بھی مشکل بھی تھا تری رہ کا
مگر ہوئی نہیں محسوس کیوں تھکن کوئی

وہ اُس کا درد ہو عاصم کہ گردشِ دوراں
رہی ہے دل میں ہمیشہ مگر چبھن کوئی

○

پاؤں زنجیر کیے دل میں بسائی منزل
دُور ہی دُور سے بس ہم کو دکھائی منزل

اے خدا مجھ میں اُتر کر مجھے رستہ دکھلا
یہ عبادت ہی نہیں میری خُدائی منزل

مَیں نہ مجبور نہ وہ اپنی طلب سے بیزار
کیوں ہوئی اپنے تعلق کی جُدائی منزل

کتنی محتاط رہی اپنے سفر کی تقسیم
راستے میرے ہوئے اور پرائی منزل

اُس کی کیا بات ہے کیا ذوقِ سفر ہے اس کا
جس نے رستے کی رکاوٹ سے اُٹھائی منزل

اور ہوں گے جنہیں رستوں نے ستایا ہو گا
ہم کو آساں تھا سفر اس نہ آئی منزل

ہم سدا دائروں میں چلتے رہے ہیں عاصم
جس کا رستہ ہی نہ تھا ایسی سجھائی منزل

رشوت

یہ افسر ہے
اِسے معلوم ہے یہ
کہ اِس کے دستخط سے
کلرکوں، مالیوں کی
اور چپڑاسی کی تنخواہوں کے بِل
خزانے سے نکلتے ہیں
ہر اک ماتحت ہے جو
کام اُس کا
کبھی تو کچھ نہ کچھ پڑتا ہے اس سے
یہ کارندوں کی مجبوری مگر
اِس کے لئے تو
ایک پیغامِ تجارت ہے
ہر اک تنخواہ کے بِل کے عوض — اور
ہر اک عرضی کے ناطے
یہ اپنے دستخط کو بیچتا ہے
خود اپنے حرص کے اُونچے محل کو
کسی کے خُوں پسینے
اور محنت کی کمائی سے
ہمیشہ سینچتا ہے

مرض

تم کیسے معالج ہو عاصم یہ بھی سوچا ہے
ہو جس دور میں زندہ تُم
اُس میں کیا کچھ ہوتا ہے
مر کھپ کر دو چار بچیں، سو مر جاتے ہیں
بھینٹ کہیں گولی بارود کی چڑھ جاتے ہیں
چند ایک نگاہوں کی روشن رکھتے ہو بصارت
کتنے گھروں کے تنگ دریچے
شام کے سائے جب پھیلیں
تو بُجھ جاتے ہیں
زخم بھرا کرتے ہو دوا اِک جسموں کے بس
کتنے زخم مگر جسموں پر سج جاتے ہیں
رات گئے تک جاگ کے اکثر
اُکھڑی سانسوں کو
کرتے ہو ہموار مگر یہ جانتے ہو تُم
ارضِ خدا کے کتنے ہی حصّوں میں ہر دم
زہریلا مکروہ دُھواں گردش کرتا ہے
ننّھے، جواں، بوڑھے جسموں میں
سم بھرتا ہے
دیتے ہو دریدہ ذہنوں کو

یکسوئی دوا سے
لیکن مقصد اَفکار روایت کرنے والوں کو
رہبر کرتے ہو

جیسی بھی ہو تلخ حقیقت
سچائی ہے
آج کا یہ جو پیشۂ طب ہے رسوائی ہے
کر نہیں سکتے کتنے ہی زخموں کا مداوا
درد دواؤں سے کم ہو جاتا ہے لیکن
یہ جو دُکھوں کا رنگ ہر اک چہرے پہ سجا ہے
اس کو کسی مرہم سے مٹانا
مشکل لگتا ہے

مشکل ہے یہ ماننا لیکن
مان لو عاصم
یہ جو مشقت روز و شب کرتے رہتے ہو
ہے تب تک بے کار
دُنیا کے ہر ایک شفاخانے میں جب تک
لُطف و محبّت امن و سکوں کے بیج ملا کر
ہو نہ دوا تیار
ہو نہ دوا تیار ٭

○

یہ معجزہ بھی مقدر بھی مجھے دکھائے کہیں
وہ اب کے آئے تو جانے کی رہ نہ پائے کہیں

چھپا چھپا کے رکھا میں نے جس کو خود سے بھی
وہ تیرا ذکر کرتا ہوں میں اب نہ آئے کہیں

ہوئی ہے عمر نبھاتے ہوئے ترے غم سے
یہ حوصلہ بھی مگر اب نہ مات کھائے کہیں

عجیب جشنِ بہاراں ہے باغ سب اُجڑے
مکان تب یہ گلوں سے گئے سجائے کہیں

تمام فصل کروں نذرِ ابر کی عاصم
جو بارشوں میں مرا کھیت بھی نہائے کہیں

○

کہیں ہمارا سفر پھر نہ بے ہنر نکلے
نہ جانے جا کے کہاں راہ بے ضرر نکلے

تمام راہ جنہیں مَیں نے راہ دکھلائی
پہنچ چکے سرِ منزل تو راہ بر نکلے

نہ جن کے پھُول نہ پتے نہ پھل نہ سائے ہیں
زمیں کی گود سے ایسے بہت شجر نکلے

نہیں ہے جس کا عدالت میں اب گواہ کوئی
وہ قتل دیکھتے کتنے گھروں سے سر نکلے

نہ جانے کیوں یہ فسانے بنائے جاتے ہیں
جو اک نظر کے تعاقب میں اک نظر نکلے

مَیں جن کو راہ زنوں میں شمار کرتا رہا
مرا نصیب وہی میرے ہمسفر نکلے

یہ کیا کہ اپنا سفر آج اُس مقام پہ ہے
جہاں سے اب کوئی عاصم نہ رہگذر نکلے

○

ورنہ کس دیوار میں موجود دروازہ نہ تھا
تیری مجبوری کو میرے غم کا اندازہ نہ تھا

خشک لب تیں کہہ سکے جو دھوپ کی تحریکِ سست
چہرۂ خورشید پہ ایسا کوئی غازہ نہ تھا

اُس میں تھا حصّہ ترا بھی میں نے جو بھگتا تمام
سب کا سب میری خطاؤں ہی کا خمیازہ نہ تھا

کس لئے ہر شخص کو تھا اپنی وحدت سے گریز
گھر یہاں بکھرا ہوا جسموں کا شیرازہ نہ تھا

جو ہمارے نیم خوابیدہ فسوں کو توڑ دے
شہر میں اتنا جواں تو کوئی آوازہ نہ تھا

چند کرنیں پوری شب سے برسرِ پیکار تھیں
اپنی قوت کا مری مشعل کو اندازہ نہ تھا

جس میں عاصمؔ زندگی کا اک ذرا سا عکس ہو
کوئی چہرہ شہر میں اتنا تر و تازہ نہ تھا

○

یُوں تو چمکی ہر اک بام پر چاندنی
ایک اتری نہ میرے ہی گھر چاندنی

ذرّہ ذرّہ چمکتا رہا تیرا غم
جگمگاتی رہی رات بھر چاندنی

کس طرح دن کی پہچان رہتی ہمیں
نقش آنکھوں پہ تھی بے ہُنر چاندنی

اُس کا چہرہ کسی چاند سے کم نہیں
اُس کو دیکھیں تو آئے نظر چاندنی

اُس نے آنے کا وعدہ کیا بھی نہیں
کیوں سجانے لگی رہ گذر چاندنی

مَیں نے کمرے کی سب کھڑکیاں کھول دیں
اب تو لائے تمہاری خبر چاندنی

اُس کی یادوں نے عاصم رلایا بہت
رات بھر مُسکرائی مگر چاندنی

سحر ہوئی تو لگا ہوں میں دم ہی اتنا تھا
کہ اپنے واسطے سورج چراغ جلتا تھا

غلاف یا وہی لائے تھے ریشمی جن کے
حسیں مکان کا ہر پائیدان چمکتا تھا

سفر مزاج ہوں جنت نشیں بھی کیوں رہنا
کسی مقام پہ کب میرا پاؤں ٹکتا تھا

وہ یوں ہوا کہ فصیلِ انا نے روک لیا
وگرنہ مجھ سے ترا فاصلہ ہی کتنا تھا

مرے تو درد کی شدت سے ہاتھ پاؤں تھے شل
تجھے تو اپنے ستم کا حساب لکھنا تھا

خبر نہیں تھی مجھے عشق کی تجارت میں
ہر ایک گام مرا سانس سانس بکنا تھا

وہ نقشِ پا جو ہواؤں کی زد پہ تھا عاصم
جو احتیاط بھی کرتے اُسے تو مٹنا تھا

○

عذابِ شام و سحر کو ملے زباں کوئی
میانِ شہرِ خموشاں اٹھے فغاں کوئی

جو رکھ سکے اسے تحریکِ کرب سے محفوظ
تمام شہر میں ایسا نہیں جواں کوئی

امیدِ خام پہ رہزن کے ظلم سہتے رہے
نہیں ملا سرِ منزل بھی مہرباں کوئی

غلط ہے چند سروں کو نصیب ہوں سائے
ہر ایک گھر کو میسّر ہو آسماں کوئی

زمیں سے اُگنے لگا آفتاب اب کی بار
بچا سکے گا کہاں ہم کو سائباں کوئی

نہیں ہے ابر نہ ہاتھوں میں چھتریاں عاصم
جواں ہے دھوپ نہیں سائے کا گماں کوئی

○

الجھتی راہیں قدم قدم اضطراب ایسا
کسی نے دیکھا نہیں سفر کا عذاب ایسا

عروسِ خامہ کا پیرہن تار تار اب کے
لٹا نہ تھا مجلۂ جمیلِ کتاب ایسا

جو اک فسانہ تھا جس کی تعبیر تھی کہانی
نہ جانے کیوں ہم نے بارہا دیکھا خواب ایسا

نگاہ میں ایک بھی تمنّا عیاں نہیں ہے
ہوا ہے غالب ہر اک خلش پہ حجاب ایسا

جو آنکھ کی تیرگی کو پیغامِ رخصتی دے
کبھی تو پیدا ہو شرق سے آفتاب ایسا

عذابِ جاں ہو سکا نہ صحراؤں کا سفر بھی
نظر میں عاصم سجا ہوا تھا سراب ایسا

سرمئی اُجالے ہوں دُور کوئی گاتا ہو
اور پھر ترا چہرہ دھن میں جھلملاتا ہو

جب سنی تری آواز یوں لگا مجھے گویا
کوئی پربتوں میں پاس بانسری بجاتا ہو

اُس کی بے بسی تو یہ بھوک جس کو کھا جائے
اور دو قدم آگے کھیت لہلہاتا ہو

تیرے پاس آنے کی خواہشوں کو یہ ڈر ہے
تیرے گھر تلک شاید راستہ نہ جاتا ہو

مصلحت نے چہرے کو زاویے دیئے اتنے
آئنہ بھی لگتا ہے مجھ پہ مسکراتا ہو

جس طرح مرے لب پر تیرا نام ہے جاناں
میرا نام بھی شاید کوئی گنگناتا ہو

رہ سجا سجا رکھے دل بچھا بچھا رکھے
کیا خبر ہے اس کے گھر کون کون آتا ہو

لہر لہر تیرا عکس دُور دُور تک جائے
آبِ دل پہ گر کوئی دائرے بناتا ہو

اُس کا ڈوب جانا بھی کوئی حادثہ ہوگا
جو بھنور کے پہلو میں کشتیاں چلاتا ہو

اب تو یُوں خیال اُس کا ساتھ ساتھ ہے عاصمؔ
جیسے اِک دِیا شب میں دُور ٹمٹماتا ہو

○

پھر طبیعت فصلِ گل سے بھی نہ بہلائی گئی
اشکِ غم سے آنکھ کی پتلی ہی گہنائی گئی

خواب میں منظر سبھی اور ساری تعبیریں بھی خواب
چشمِ پرآشوب کی حد تک نہ بینائی گئی

ہر نئی شب دیکھتے گزری نئے خوابوں کے خواب
ہر سحر لیکن وہی تعبیر دہرائی گئی

اُس کا پیکر میری چشمِ تر میں اک قوسِ قزح
دل سے دل تک بھیگتے جذبوں کی انگڑائی گئی

شہر بھر میں اک وہی تھا زندگی کا ہم مزاج
جس کو عاصمؔ جبر کی زنجیر پہنائی گئی

○

شہر کے ہر ایک گھر میں جیسے بیماری بڑھی
اُس قدر سرعت سے لوگوں میں غمخواری بڑھی

اس طرح آنے لگے ہیں اب پرندے زیرِ دام
جیسے اِن معصوم سے ذہنوں میں ہشیاری بڑھی

جب کبھی پائی فراغت اُس کی یاد آنے لگی
اور بھی مصروفیت ٹھہری جو بیکاری بڑھی

لوگ سوئے ہیں تو حرمت ہے عقیدوں کو نصیب
یہ بکھر جائیں گے جب ذہنوں میں بیداری بڑھی

ہو گئے پختہ مکانوں کے در و دیوار ریت
شہر کے کچے گھروں میں جب بھی ناداری بڑھی

جس شجر کے سائے سے ہم کو بہت امید تھی
صرف اُس کو کاٹنے کے واسطے آری بڑھی

اُس کی ہمراہی میں بھی عاصمؔ مرا یہ حال ہے
ہو گئی بوجھل طبیعت دل کی بیزاری بڑھی

ہر ہجومِ بے کراں میں عکس تنہائی کا تھا
شائد اُس میں سب ہنر اپنی ہی بینائی کا تھا

بلبلوں نے دی کسی کے ڈوب جانے کی خبر
دُور تک پانی پہ پھیلا سلسلہ کائی کا تھا

جو بدن میں جان کا احساس مجھ کو دے سکی
موت کی تخلیق میں حصّہ اُس انگڑائی کا تھا

ڈوب جانے میں ہنر تھا ناخداؤں کا شریک
ورنہ اندازہ مجھے دریا کی گہرائی کا تھا

تھا انا کا رنگ میری شخصیت سے بھی عیاں
ذات میں عنصر بہت اس کی بھی خود رائی کا تھا

رہ گیا اس واسطے دلچسپ قصّہ ناتمام
ہم کو شہرت سے حذر خوف اس کو رسوائی کا تھا

جیسے ہر اک شخص کو تھا اپنی وحدت سے گریز
شوق یوں لوگوں کو عاصم بزم آرائی کا تھا

○

کیا عجب قصہ ہے یہ گھر اُس کی نگرانی میں ہے
ہاتھ جس کا کچھ نہ کچھ ہر گھر کی ویرانی میں ہے

زندگی بوڑھی ہوئی جاتی ہے یادیں ہیں جواں
عکس کیوں ٹھہرا ہوا بہتے ہوئے پانی میں ہے

راہ رو سب خوف سے سہمے ہوئے ہیں آج کل
سوچتا ہوں قافلہ کس کی نگہبانی میں ہے

کس طرح اُبھرے گا سورج ابر ہے گہرا بہت
کس طرح دیکھوں گا منظر آنکھ طغیانی میں ہے

اس جدائی کا سبب میں ہوں مجھے منظور یہ
فائدہ لیکن کہاں کچھ اب پشیمانی میں ہے

مجھ کو اُکتانے لگی حالات کی یکسانیت
ہر مسافت کا مزہ مشکل میں آسانی میں ہے

کس لئے عاصمؔ حقائق ہو گئے ہم پر گراں
کیوں دروغِ مصلحت آمیز ارزانی میں ہے

محبّت

محبّت خوب صورت ہے
محبّت میں
عقیدت ہے
شہادت ہے
ولادت ہے
جواں جذبات کی جن سے
دلوں میں پھول کھلتے ہیں
محبّت کرنے والے
کس قدر ہنس ہنس کے ملتے ہیں
محبّت کی کوئی رنگت نہیں ہے
نہ کوئی شکل ہے نہ جسم اس کا
یہ وہ پیکر ہے جو
ہر ایک صورت میں حسیں ہے

☆

محبت خوب صورت ہے

نفرت

مجھے نفرت سے نفرت ہے
یہ وہ عفریت ہے
جو گلشن لب پہ سجاتا ہے
ردائے خارِ دشنامی
یہ دستِ بے ضرر میں
خنجرِ قاتل اُگاتا ہے
یہ اُن آنکھوں کو جو
معصوم تر ہیں
ضیائے قہرِ نازیبا دکھا کر
سُرخ کرتا ہے
یہ ہنستے کھیلتے آباد گھر کو
بلکتی سسکیوں سے
اور اشکوں سے سجاتا ہے
غرض یہ کج ادا عفریت
خوشحالی کے رشتوں کی رکاوٹ ہے

٭

مجھے نفرت سے نفرت ہے

تضاد

آج اخبار میں یہ ایک خبر بھی دیکھی
کل سرِ شام مرے شہر میں اک باغ کے بیچ
دو دھڑکتے ہوئے دل جھوم کے کھل اُٹھے تھے
وہ ہم آغوش تھے اک جذبِ محبّت کے عوض
یہ مرے شہر کا دستور نہیں ہے لیکن
اُن کو الزامِ فحاشی کے عوض قاضی نے
کی عطا تین مہینے کی سزائے بندش
مجھ کو قانون پہ عاصم یہ مگر حیرت ہے
کہ اسی شام گیا سیر کو بازار کی مَیں
تو وہاں مَیں نے یہ مکروہ نظارہ دیکھا
شکل و صورت سے مہذب تھے مگر دو حضرات
خون آنکھوں میں رکھے لب پہ سجائے دشنام
جذبِ نفرت کے عوض دست و گریباں ہوئے
مائیں بہنیں بھی تھیں موجود وہاں بچے بھی
نفرتوں کا یہ سماں سب پہ عیاں تھا یعنی
پھر بھی قانون کوئی اُن کے نہ آڑے آیا
ذہن میں صرف مرے ایک سوال اُٹھتا ہے
کیوں مرے شہر میں الفت کی ادا شرمندہ
کیوں مرے شہر میں نفرت پہ نہیں ہے بندش

○

ہم اس مقام پہ یوں ہی تو بدحواس نہیں
سیہ ہے دھوپ نظر تیرگی شناس نہیں

ترے خیال کا سورج سجا ہے دل میں مگر
ترے یقین کا سایہ تو آس پاس نہیں

مویشیوں کے بدن ہو چکے ہیں سب لاغر
زمیں کے سوکھے ہوئے جسم پر بھی گھاس نہیں

تجھے بھی میری طرح میرا اعتبار کہاں
مجھے بھی تیری طرح تجھ سے کوئی آس نہیں

ہر ایک آنکھ میں سورج کھلا ہوا دیکھوں
کسی بھی گھر سے سحر کا مگر نکاس نہیں

وہ شخص تھی جسے صحرا میں آب کی خواہش
پہنچ گیا لبِ دریا تو جیسے پیاس نہیں

کچھ اس میں اُس کی بھی عاصم ہے آرزو شامل
مری زبان پہ میری ہی التماس نہیں

○

صرف اتنا ہے مرے باغ سے ہٹ کر برسے
ورنہ یہ ابر تو اِس شہر میں گھر گھر برسے

چھیدریوں پھولوں کے سینوں میں ہوئے ہیں اب کے
جیسے بوندیں نہیں بادل سے بھی کنکر برسے

مَیں تجھے دیکھ کے خود اپنا یقیں لیتا ہوں
تری آنکھوں سے مری ذات کا منظر برسے

یہ تو وہ خاک ہے سیراب نہیں ہونے کی
اس پہ چاہے کوئی دریا کہ سمندر برسے

دُھوپ کی اب کے ضرورت تھی مرے کھیتوں کو
اور اِس بار یہ بادل تھے کہ اکثر برسے

خشک بادل تو مری آنکھ تک آئے عاؔصم
ابر بھیگے ہوئے سارے مرے اندر برسے

اور پھر یوں بھی ہوا تیرے چلے جانے کے بعد
دل کو بہلانا پڑا ، ہر بار بہلانے کے بعد

پھول، خوشبو، تتلیاں، قوسِ قزح برکھا بہار
بس گئے دل کے چمن میں تیرے آجانے کے بعد

رکھ لیا کیسا بہاروں کا خزاؤں میں بھرم
تتلیاں کھلنے لگیں پھولوں کے مرجھانے کے بعد

مجھ کو پھر کیا کیا سہاروں کا گماں ہونے لگا
ہاتھ ہر شانے پہ رکھا میں نے اس شانے کے بعد

اے خدا تیری وساطت سے خدا کیا کیا ملے
مَیں تو منکر ہو گیا تجھ پہ یقیں لانے کے بعد

فکر سچائی پہ مبنی ہے تو عاصم یہ کہو
لوگ کیوں سنتے ہیں افسانہ ہی افسانے کے بعد

○

تتلیاں شاخوں پہ رکھ کر پھول چنوانے لگے
باغباں اس طرح گلچینوں کو بہلانے لگے

جانے کیسے اس کی ہر خواہش سے میرا ربط ہے
اس کے سب سپنے مجھے بھی جانے پہچانے لگے

دل میں تیرے بعد ہے تیرے خیالوں کا ہجوم
ساحلِ ویراں پہ کیا عمدہ جہاز آتے لگے

نیند جیسے آ گئی ہر درد کے احساس کو
جب تمہارے ہاتھ میرا جسم سہلانے لگے

جن سے ہم کو دھوپ میں سائے کی کچھ امید تھی
راہبر راہوں سے ایسے پیڑ ہٹوانے لگے

جن پہ چڑیوں کے بہت سے گھونسلے آباد تھے
اک الاؤ کے لئے وہ پیڑ کٹوانے لگے

میرا ہر اک شعر میری زندگی بن جائے گا
زیرِ لب عاصم اگر وہ ان کو دہرانے لگے

○

شہر میں پھیل گئیں اب کے وبائیں کیا کیا
لوگ کرنے لگے مرنے کی دعائیں کیا کیا

تیری سانسیں تری آواز ترے پاؤں کی چاپ
تو نہیں ساتھ ہیں یہ تیری ادائیں کیا کیا

پاؤں میں جست کی طاقت بھی نہیں ہے باقی
اور اڑنے کو ہیں آنکھوں میں فضائیں کیا کیا

دیکھنے میں تو بدن سب کے یہاں ہیں لاغر
اور کہنے کو یہ کھاتے ہیں غذائیں کیا کیا

ہوش کی تلخ ہوا سب کو کھنڈر کرتی ہے
یوں تو خوشیوں کے محل خواب سجائیں کیا کیا

کتنی مجبور ہے اس شہر کی خلقت عاصم
جرم کرتی نہیں سہتی ہے سزائیں کیا کیا

○

سفر سے پہلے فضا کا تناؤ دیکھنا تھا
نمی کا حجم ہوا کا دباؤ دیکھنا تھا

مجھے بھی چاہیئے تھا جھانکنا ترے دل میں
تجھے بھی اپنی نظر کا سبھاؤ دیکھنا تھا

بس اب تو بات ہی کچھ اور ہو گئی یارو
وہ پہلے پہلے نگاہوں کا چاؤ دیکھنا تھا

یہ کیا کہ ایک شجر پہ ہی ٹوٹ کر برسو
بہت سے پیڑ تھے سوکھے گھٹاؤ دیکھنا تھا

مجھے بھی ناپنا گہرائی اس کی آنکھوں کی
ہے گہرا کس قدر اپنا بھی گھاؤ دیکھنا تھا

جو ان تیرگی میں اُس کو کھا لیا تم نے
مرا تو ایک دِیا تھا ہواؤ دیکھنا تھا

کِرن کِرن میں تھا عاصم مزاج اندھیروں کا
سحر کی راہ میں شب کا پڑاؤ دیکھنا تھا

○

کچھ اب کی بار تو ایسا بپھر گیا پانی
بہا کے لے گیا ہر شے جدھر گیا پانی

یہ المیہ بھی عجب ہے کہ دشت سے دریا
پلٹ کے پوچھ رہا ہے کدھر گیا پانی

کسی بھی نل میں نہیں کوئی ایک بوند مگر
ہر اک مکان کے کمروں میں بھر گیا پانی

دھنک کے رنگ اُبھر آئے قطرے قطرے میں
تمہارے جسم کو چھو کر نکھر گیا پانی

ہے عام شہر میں دستور بے حجابی کا
ہر ایک شخص کی آنکھوں کا مر گیا پانی

میں تشنہ بخت اُسے ہاتھ بھی لگا نہ سکا
مرے قریب سے ہو کے گزر گیا پانی

کسی بدن میں ہنر زیست کا نہیں عاصم
ہوا بھی کیا جو سروں سے اتر گیا پانی

ایسی راہ پہ کیوں چل نکلے لوٹ کے جانا مشکل ہو
ایسی باتیں کیوں کرتے ہو جن کا نبھانا مشکل ہو

تم نے جان کے آنسو جس کو اپنی آنکھ سے جھٹکا ہے
سب کہتے ہیں شاید تم کو اس کا بھلانا مشکل ہو

لوٹ چلو تم گھر کو جلدی ایسی دیر نہ ہو جائے
ایسی باتیں پوچھیں سارے بات بنانا مشکل ہو

رات کے شہر میں شور نہ کرنا کہہ دو پختہ سالوں سے
بچے جاگ گئے تو شاید انہیں سلانا مشکل ہو

میں اس خوف سے اپنے دل کی خواہش کہتے ڈرتا ہوں
تم کو بات نہ آئے سمجھ میں اور سمجھانا مشکل ہو

میرے گھر کے آنگن میں تالاب کے اندر سورج ہے
پیاس لگے تو جلتا پانی منہ کو لگانا مشکل ہو

میں نے سارے سخت مراحل حسن طرز سے برتے ہیں
تم کو منانا کیا مشکل ہے خیر یہ مانا مشکل ہو

درد کی اک اک ٹیس کی لے پر میں نے جس کا نام لیا
ایسا نہ ہو وہ سن بھی لے اور اُس کا آنا مشکل ہو

شہر میں برپا مرگِ صدا ہے ایسے میں نغمے کی لے
ایسی کھرج پر مت لے آنا جس میں گانا مشکل ہو

اب کے فضا میں پھیل گیا ہے خونِ محبّت کا ایسا
فاختہ امن کی چاہے بھی تو پر پھیلانا مشکل ہو

ایسا پڑاؤ آپ ہی منزل کی صورت بن جاتا ہے
جس سے مڑ جانا ناممکن آگے جانا مشکل ہو

رنگ لہو کا چیخیں دُکھ کی روشنی بجھتی آنکھوں کی
پھر کیوں شہر میں عاصم اب کے جشن منانا مشکل ہو

○

اب اگر تم کو مرے غم کا خیال آیا تو کیا
ڈوب جانے پر سمندر میں اُبال آیا تو کیا

مَیں نے تو اک عمر تک رکھا ہے خود کو غم نصیب
راحتیں دینے کا اب تجھ میں کمال آیا تو کیا

جس جگہ ہر شخص ہو خود آپ ہی اپنی مثال
اُس جگہ بن کر کوئی بھی بے مثال آیا تو کیا

ساحلِ دل پر چلا آیا محبّت کے جہاز
اب کوئی ملنے بچھڑنے کا سوال آیا تو کیا

نفرتوں کے شہر میں آنکھوں کو کیا تحریک دُوں
دل کے آئینے میں کچھ عکسِ جمال آیا تو کیا

یُوں بھی سب سلجھی ہوئی سوچوں کا اب ہے تا قِتل
اس لئے اس دَور میں قحط الرجال آیا تو کیا

جس میں سب کے سب مراسم فاصلوں کی شرط تھے
دل سے گر ایسا تعلق میں زوال آیا تو کیا

مچھلیاں جب سب کی سب اپنا بچاؤ کر چکیں
تب مچھیرا اڈا لئے دریا میں جال آیا تو کیا

جو زمیں پر کر رہا ہے آج کل سُورج کی کاشت
وہ دہکتی دھوپ پر بادل بھی ڈال آیا تو کیا

شاہ کے آگے تو اک اک بات سے ڈرتا تھا جی
پھر طبیعت میں اگر کچھ اشتعال آیا تو کیا

شہر بھر کو قحط نے عاصمؔ کبھی کا کھا لیا
اب جو بندرگاہ پر بھر بھر کے مال آیا تو کیا

صدائیں دے کے تمہیں پاس بھی بُلا نہ سکے
قریب آئے مگر اس قدر بھی آ نہ سکے

کوئی نہ پوچھتا پھر تیری خاصیت لیکن
کسی کی آنکھ میں اپنی نظر سجا نہ سکے

نظر کی جھیل پہ خواہش کی پتّیاں تیریں
کنول جو تہہ میں اُگے تھے اُنہیں چھپا نہ سکے

جو پھول ہم نے سنوارے تھے اپنا خوں دے کر
وہ کِھل اُٹھے تو اُنہیں ہاتھ بھی لگا نہ سکے

تجھے گمان نہ ہو گا مجھے خیال نہ تھا
اِسی لئے تو جُدائی کا غم اُٹھا نہ سکے

محبّتوں کو مقید بھی کس لئے کہتا
نہیں کہ تاج محل اب کوئی بنا نہ سکے

شکوک دل میں کچھ اتنے تھے عاصم اب کی بار
ملے جو ہم تو نظر سے نظر ملا نہ سکے

○

ایسا بھی ہے کہ درد مرا معتبر نہیں
ایسا بھی ہے کہ تیری دوا میں اثر نہیں

دُکھ تو یہی ہے ڈوبا تھا تیرا اک جس جگہ
دریا میں اُس مقام پہ کوئی بھنور نہیں

ہر اک مکاں میں قید ہیں یاں پتھروں کے جسم
سنگیں ہے سنگ پاش ہماری نظر نہیں

جس کو ہو منزلوں کی توقع خفیف سی
اُن راستوں کی زد میں ہمارا سفر نہیں

ہے شہر میں تو خوف مہذّب جنون کا
جنگل کے وحشیوں کو تو وحشت کا ڈر نہیں

دیکھی ہے ہم نے طاقتِ پرِ انز رُوح کی
جو جسم ساتھ لے کے اُڑے یہ وہ پر نہیں

کیسے چھُپیں گے راز مرے خاندان کے
عاصم مرے مکان کے دیوار و در نہیں

تاریخِ تیرہ

جب مرے دَور کی تاریخ لکھی جائے گی
لفظ مجبور پریشان نظر آئیں گے
روشنائی کے لئے خوں کی ضرورت ہوگی
سارے صفحات پشیمان نظر آئیں گے

○

جسم در جسم سبھی ہوگی صلیبوں کی قطار
چشم در چشم کبھی ہوگی اندھیرے کی فصیل
شہر در شہر سجائے گئے مقتل ہوں گے
مُلک در مُلک سبھی ہوگی عداوت کی سبیل

○

طفلِ نوخیز کی معصوم شرارت اک ایک
اور خواتین کی پاکیزہ ادائیں ساری
نوجوانوں کے حسین اور شگفتہ انداز
ہوں گے پوشیدہ پسِ پردۂ صد ناچاری

سایہ اُمید کا ہوگا نہ کسی سر پر بھی
بھوک جسموں کی نگہبان نظر آئے گی
سب مکانوں سے حفاظت کی ادا کم ہو گی
ہر گلی شہر کی ویران نظر آئے گی

○

اختلافات مذاہب کی بِنا پر ہوں گے
اور عقیدوں کے حوالے سے عداوت ہوگی
ہوگا دستور کی بنیاد پہ دل میں کینہ
رنگ اور نسل کی تہذیب روایت ہوگی

○

مختصر یہ کہ مورّخ کو بھی خوف آئے گا
جُنبشِ خامۂ بیزار بھی پچھتائے گی
حرمتِ حجلۂ تدریس نہ لازم ہوگی
جب مرے دَور کی تاریخ لکھی جائے گی

یقینِ بہار

مرے چمن میں ہمیشہ خزاں نہیں ہوگی
رہے یقین کبھی تو بہار آئے گی
کبھی تو ابر سے ہوگا نزولِ باراں بھی
کبھی تو دھوپ کی ہمت بھی ٹوٹ جائے گی

جو بیج بوئے ہیں ہم نے ہزار چاؤ سے
کبھی تو بادِ صبا اُن پہ مسکرائے گی
شجر شجر کو لباسِ حسیں عطا ہوگا
ہر ایک شاخ نئے ڈھب سے لہلہائے گی
ہر ایک سمت کھلیں گے حسین نئے پتّے
کلی کلی نئے رنگوں سے جھلملائے گی
پھلوں کو ہوگی میسّر لطیف شیرینی
گلوں کی شوخ ادا آنکھ کو لبھائے گی
حسین گھاس کی مخمل کسی دلہن کی طرح
زمیں کے جھلسے ہوئے جسم کو سجائے گی
فضائیں ہوں گی معطّر شگفتہ خوشبو سے
ہر ایک پھول پہ شبنم گہر لٹائے گی

رہے گا رقص جواں جب بھی چاندنی شب میں
لرزتے جھومتے پتّوں پہ جگمگائے گی
سحر کے وقت شگفتہ مزاج ہر کوئل
خُدا کے لکھے ہوئے گیت گنگنائے گی
قدم قدم پہ چرند و پرند کھیلیں گے
کوئی نگاہ کسی سے نہ خوف کھائے گی
حریم چشم میں اک عافیت رہے گی سدا
جدھر بھی آنکھ اُٹھے گی سکون پائے گی
مرے چمن میں ہمیشہ خزاں نہیں ہو گی
رہے یقین کبھی تو بہار آئے گی

مرے شہرِ پریشاں میں

مِرے شہرِ پریشاں میں
مجھے امید ہے اک دِن
کسی خاتونِ پاکیزہ کی آغوشِ محبت میں
نمودِ طفلِ خوش اسلوب ہو گا
جوانی میں جو ہر اک آنکھ کا محبوب ہو گا
ہر اک چہرے کو دیکھے گا محبّت کی نظر سے
کرے گا امن کا قانون رائج
حفاظت کا ہنر دے گا ہر اک دیوار و در کو
پیامِ رخصتی دے گا
کبھی فتنہ و شر کو
ہر اک چشمِ عداوت کو
ردائے تیرگی دے گا
چراغِ عشق کی لَو کو
ادائے نور بخشے گا
سُنائے گا پیامِ فصلِ گُل

ہراک چمن کو
ہراک باورچی خانے میں اُگائے گا غذائیں
ہراک جسمِ برہنہ کو لباسِ برگِ انجیر
ہراک ذہنِ شکستہ کو
کشادہ سوچ سے آراستہ کر کے
نئی وسعت سجھائے گا
پیامِ زیست لائے گا
مرے شہرِ پریشاں میں
کبھی تو اِک جوان ایسا بھی آئے گا ٭

○

چھتوں پہ طنز ہوئے بام و در کی بات ہوئی
پرائے گھر میں مرے اپنے گھر کی بات ہوئی

جسے سمجھا یا مقابے کار جہان کہ ہم نے
ہوئی جو رات تو پھر اس شہر کی بات ہوئی

نہ تو نے لفظ ہی پائے نہ میں نے گویائی
نظر کی بات تھی ساری نظر کی بات ہوئی

ستم کا ذکر رہا اور ملالِ فتنہ گری
پھر اس کے بعد کسی چارہ گر کی بات ہوئی

کسی کے تجربے ٹھہرے کسی کی دلسوزی
کوئی مرا تو دوا کے اثر کی بات ہوئی

ق

ہر ایک چیز کی پہچان اُس کی نسبت ہے
خیال سائے کا آیا شجر کی بات ہوئی

تمہارا ذکر رہا کل تو بزمِ یاراں میں
وہ یوں کہ عالمِ آشفتہ سر کی بات ہوئی

○

بقا کی رہ میں فنا کا کوئی نشان ہی کیوں
ہوا کے شہر میں سب ریت کے مکان ہی کیوں

جو ایک پاؤں کا بھی بوجھ سہہ نہیں سکتے
مکانِ شاہ کے سب ایسے پائیدان ہی کیوں

تجھے بس اپنی اداؤں پہ ناز ہے جاناں
مری نگاہ کا پھر اس قدر رہے دھیان ہی کیوں

ترے غموں کا ہے سودا تو پھر خوشی کا مجھے
کوئی خیال ہی کیسا کوئی گمان ہی کیوں

جنہیں ملے نہ مری اک خوشی سے کوئی خوشی
وہ لوگ آئیں مرے غم کے درمیان ہی کیوں

ہے اب کی بار تو ہمراہ ابر بھی عاصم
چلے ہو ساتھ لئے اب کے سائبان ہی کیوں

○

جنوں کو شہر میں یوں بے مثال ہم نے کیا
ہر ایک زخم کو سینے پہ ڈھال ہم نے کیا

تمام شہر تھا مشتاقِ احتسابِ عمل
امیرِ شہر سے پہلا سوال ہم نے کیا

بکھرتے پھول سے بھی خوشبوؤں کا سودا ہے
خزاؤں سے بھی کشیدِ جمال ہم نے کیا

جو خارِ راہ تھے اُن کو خود اپنے تلووں سے
کبھی نہال کبھی پائمال ہم نے کیا

جنہیں فروخت کیا مفتیوں نے سکہ کے عوض
انہیں عقیدوں کا منصب بحال ہم نے کیا

طمانچے شہر کی جب رسم بن گئے عاصمؔ
تو انگلیوں کے نشانوں کو گال ہم نے کیا

ترے بدلنے پہ سب میرے خواب ٹوٹ گئے
لگی جو ناؤ کنارے حباب ٹوٹ گئے

ہوئی ہیں اب کے بہاروں میں بارشیں اتنی
کھلے تھے جتنے شگفتہ گلاب ٹوٹ گئے

بڑی عجیب ہے قسمت مرے گھرانے کی
جو خوش خیال تھے وہ انقلاب ٹوٹ گئے

کبھی تو یہ بھی خبر آئے ظلم کے آگے
ڈٹی ہیں ایسے بھی چڑیاں عقاب ٹوٹ گئے

بکھر بکھر گیا ہے چشمِ تر میں عکس ترا
نقوشِ گل پسِ دیوارِ آب ٹوٹ گئے

ہوائے درد نے آنکھوں پہ ریت پھیلا دی
نظر میں تھے جو خوشی کے سراب ٹوٹ گئے

جو سست رو تھے انہیں منزلیں ملیں عاصم
جو راستوں میں رہے کامیاب ٹوٹ گئے

○

جسم لاغر ہو تو کیا ہو گی بھلا ماس کی کاشت
آب کے کھیت پہ ہوتی ہے کہیں پیاس کی کاشت

آن کی آن میں کیوں کاٹ دیا ہے اُس کو
کی تھی اک عمر سے اک پیار سے جس آس کی کاشت

ہر مویشی کا بدن کانچ سے کمزور وہاں
شوق سے کرتے ہیں سب لوگ جہاں گھاس کی کاشت

مَیں خزاؤں کو بھی دیتا ہُوں بہاروں کا شعور
ہجر کے پھُول پہ کرتا ہُوں تری باس کی کاشت

اُس کے انجام کی تم آپ ہی سوچو، جس کا
جسم شیشے کا ہو، لیکن کرے الماس کی کاشت

زندگی موت کے سودے سے گراں ہو جیسے
لوگ کرتے ہیں عجب ڈر میں انفاس کی کاشت

دل میں ہیروں کی چمک رکھتے ہیں عاصمؔ وہ لوگ
جسم کے کھیت میں کرتے ہیں جو افلاس کی کاشت

○

کچھ لوگ دل سے معتقدِ بادشاہ تھے
باقی جو تھے خموش اسیرِ پناہ تھے

میں سوچتا ہوں سنگِ ملامت لئے ہوئے
آئے جو میری سمت وہ کب بے گناہ تھے

ہم دیکھتے تو کیسے رہائی کا معجزہ
یوسف نہیں تھے گرچہ اسیرانِ چاہ تھے

وہ بھی شریکِ ظلم ہیں میرے خیال میں
پیشِ ستمگراں بھی جو محرومِ آہ تھے

راتوں کی تیرگی ہی فقط دل شکن نہ تھی
دن کے کئی نقوش بھی خاصے سیاہ تھے

کرتے تھے میری ذات سے معصومیت کشید
جو لوگ آج میرے مخالف گواہ تھے

عاصم دراز قامتی اک جرم تھی وہاں
پستہ قدانِ شہر سبھی کج کلاہ تھے

○

اِک دریچے سے تپش اِک سے ہَوا لی جائے
ایسی تفریق مرے گھر سے اُٹھا لی جائے

کچھ نہ کچھ آبروئے طاقتِ ضو رکھنی ہے
ہو اندھیرا تو ہر اک شمع بجُھا لی جائے

مَیں ترے کوچے سے یوُں لَوٹ کے آیا جیسے
ہار کے سُوکھے ہوئے کھیت سے مالی جائے

نفرتوں کا سرِ جلوت ہے بپا ہنگامہ
چشمِ اُلفت دمِ خلوت بھی جھکا لی جائے

ایسے گھر کی نہ کوئی شکل نہ صورت جس کے
ایک ہی کمرے میں ہر چیز سجا لی جائے

میں تو اُس قاتلِ ناکام کی مانند ہوا
جو سزاوار بھی ہو وار بھی خالی جائے

روشنی پہنے ہوئے پیرہنِ شب اُتری
اب متاعِ زرِ انوار سنبھالی جائے

میں تو اُس دور کا بچہ ہوں کہ جس کی خاطر
چاند اُترے نہ کہیں ہاتھ سے تھالی جائے

مال و زر کی تو کسے فکر ہے عاصم اب کے
یہ غنیمت ہے جو حرمت ہی بچا لی جائے

تمام درد تری بے رخی کے رنگ میں تھا
بدن پہ زخم نہیں تھا وہ تیرے سنگ میں تھا

ستم تو یہ ہے ملا تجھ سے جس گھڑی اس دم
مَیں اپنی ذات کی کمزوریوں سے جنگ میں تھا

پسِ وداع تہی دست کب رہا میں بھی
کہ تیرے بعد ترا درد انگ انگ میں تھا

کسی مکاں سے ہوا کا گزر نہ تھا ممکن
ہمارا شہرِ کشادہ فصیلِ تنگ میں تھا

مَیں اپنے پیار کو فولاد کس طرح کرتا
مرے نصیب کا لوہا دکھوں کے زنگ میں تھا

تھی کروٹوں کی مشقت گزارنا شب کا
تمہاری یاد کا کانٹا مرے پلنگ میں تھا

جُھکا نہیں تری دہلیز پہ ترا عاصم
کہ خود سری کا سلیقہ بھی اس ملنگ میں تھا

فضا میں تھا تو سلگنے لگے تھے پر میرے
زمیں کو چھو کے ہوئے پاؤں خستہ تر میرے

میں اپنے گھر میں ہی اب ایسا اجنبی ٹھہرا
کہ پوچھتے ہیں مرا نام بام و در میرے

کھلی سڑک ہے کہیں کوئی آس پاس نہیں
چلے گئے ہیں بہت دور ہمسفر میرے

شجر بڑھا ہے مرے صحن کا کچھ اب اتنا
پرائے گھر میں گرے سب کے سب ثمر میرے

کوئی فغاں کہ نہیں سوز ہی صداؤں میں
ذرا سا کرب کہ ہیں لفظ بے اثر میرے

مرے بدن پہ ہیں سب دھوپ کی تپش کے نشاں
کمال سائے کا رکھتے ہیں یہ شجر میرے

سمندروں میں گھٹائیں اتر گئیں عاصم
اُگی ہیں حسرتیں ہر تشنہ کھیت پر میرے

○

میں سربلند رہوں مجھ کو ایسا زر دیتا
زمین دی تھی زمیں پہ بلند گھر دیتا

اگر وہ آئینہ تھا میرا عکس ہو جاتا
اگر تھا آئینہ گر مجھ کو عکس کر دیتا

قدم قدم مرے رستوں کو سختیاں دے کر
نہیں کہ حرفِ دُعا میں بھی کچھ اثر دیتا

بلندیوں سے تھا رشتہ ہر اک خوشی کا اگر
تو ہر نحیف بدن کو جوان پَر دیتا

دیا تھا اُس کو بدلنے کا گر کمال ایسا
تو بھولنے کا مجھے بھی ذرا ہُنر دیتا

قدم قدم جو دیئے تھے خدا معاشرے کو
ہر ایک جسم کو پھر بے ضمیر کر دیتا

ہزار قطرۂ خوں دے چکے زمیں کو مگر
یہ پی کے بیج کوئی ایک ہی شجر دیتا

جو میرے چہرے سے تحریرِ آرزو پڑھ لے
اُس آنکھ کو کوئی ایسی ہی اک نظر دیتا

وہ جس مکاں کے مکیں آپ دزد پیشہ ہوں
کوئی بھی کب اُسے محفوظ بام و دَر دیتا

اخبار رساں اللہ حافظ

میرے گھر جو روز سویرے دینے آتا ہے اخبار
اُس سے کل اخلاقاً پوچھا
کام میں جی لگتا ہے بھائی
مایوسی سے بولا، صاحب
روزی ہے بس مل جاتی ہے
ورنہ اِس سے بدتر کام بھلا کیا ہوگا
پَو پھٹتے ہی
گھر گھر جاکر
قتل و غارت
جنگ و قحط کی
خبریں بانٹتا پھرتا ہوں میں
یعنی ہر اک آنکھ کے آگے
درد سجاتا پھرتا ہوں مَیں"
یہ کہہ کر خاموش ہُوا وہ
دُور فضا میں گھور کے دیکھا

اور پھر بولا
جو مرضی مولا کی صاحب
اُس کے بھید وہ خود ہی جانے
ہم کم عقل کہاں سمجھیں گے
اچھا صاحب
مولا آپ کو اپنی حفظ و امان میں رکھے
مَیں چلتا ہُوں
(اللہ حافظ)

چال

مَیں لَوٹا تو مَیں نے دیکھا
آج بھی سورج کے سائے میں
دوڑ ہر اک ایسی تو نہیں ہے
جس میں سُبک رفتار ہوں آگے
ایسی تو ہر جنگ نہیں ہے
جیت ہو جس میں طاقتور کی
فہم و فراست جن کو ملی ہے
دولت اُن کے ہاتھ نہ آئی
جن کو عقل ملی ہے اُن کو
روٹی ہاتھ نہیں لگتی ہے
جن کے ہاتھ میں کوئی ہنر ہے
اُن کی پشت پناہی کم ہے
مَیں نے جانا
وقت اور قسمت
آج بھی سب سے کھیل رہے ہیں

ہے معلوم ہر اک اِنساں کو
وقت نہیں ہے اُس کے بس میں
اور قسمت قابو میں نہیں ہے
وہ تو اُس مچھلی جیسا ہے
جو شیطانی جال کی تاروں کی گرہوں میں
پھنس جاتی ہے
ایسے پرندے کی صورت ہے
زیرِ دام جو آجاتا ہے
وقت جکڑے جب پنجے ہیں
ہو جتنی بھی پاؤں میں تیزی
اور ہنر ہو ہاتھ میں جو بھی
طاقت، عقل و فہم و فراست
دھن اور دولت
پُشت پناہی
کچھ بھی کام نہیں آتا ہے
کھو جاتا ہے ٭

ایتھوپیا

زمینِ بے آب پر دراڑیں پڑی ہوئی ہیں
کوئی بھی دانہ اناج کا اب
نگاہ میں ہے
نہ ہاتھ میں ہے
شکستہ جسموں کے کارواں سب
قدم قدم بھوک چن رہے ہیں
اُداس آنکھوں میں ابرِ فاضل
کہیں بہ حدِّ نگہ نہیں ہے
ہوائے تازہ سے کھیتوں میں
کوئی بھی خوشہ نہیں لرزتا
کسی بھی گرمی زندہ بدن کے سہارنے کو
کسی گھنے پیڑ کا کوئی سایۂ تحفّظ نہیں لپکتا
یہیں مگر خستہ حال جسموں کی بے بسی کا
بیان ہوتا نہیں مکمّل ——
ذرا سا ہٹ کر

اسی شکستہ زمین کے بے نیاز بیٹے
عداوتوں کی صلیب اُٹھائے ہوئے کھڑے ہیں
بفیضِ تقدیسِ فتنہ سازی
ہوئے ہیں مصروفِ جنگ ایسے
کہ کچھ خیالِ شکستگیٔ ضعیف و طفلاں نہیں رہا ہے
وہ بے حسی ہے
کہ اپنی شعلہ فشانیوں سے
تمام خوراک خیز ہاتھوں کی انگلیاں تک جلا گئے ہیں
خدا دکھائے نہ جو کسی کو
ہمیں وہ منظر دکھا رہے ہیں
مقابلِ چشمِ ضعف پرور
شکستہ و بے اساس جسموں کی ہڈیاں تک جھڑی ہوئی ہیں
زمینِ بے آب پر دراڑیں پڑی ہوئی ہیں

ہمیں مکان سے جس شخص نے نکالا ہے
اُسے تو ہم نے بڑی چاہتوں سے پالا ہے

امیرِ شہر کے ناخن ہیں خنجروں جیسے
ہمارے ہاتھ میں برچھی کوئی نہ بھالا ہے

ہر ایک کھال پہ کندہ فسانۂ تقدیر
وہ بدنصیب ہے جس کا بھی رنگ کالا ہے

کہاں ملے گا ہمیں سنگِ ریزۂ منزل
ہمارے پاؤں میں تو گمرہی کا چھالا ہے

پھروں گا شہر میں اب میں بھی سیپیاں لے کر
کہ تم نے پہنی ہوئی موتیوں کی مالا ہے

تمہاری یاد کو میں کیسے بے ہنر جانوں
کہ لڑکھڑانے لگا جب مجھے سنبھالا ہے

یہ کن نحیف سی تاروں میں قید ہوں ناصر
مگس پہ جیسے کئی مکڑیوں کا جالا ہے

○

چمن میں یوں تو بہت غلغلہ بہار کا ہے
مگر وہ رنگ جو پھولوں میں انتشار کا ہے

میں کس لئے تری مجبوریوں پہ طنز کروں
تمام حسنِ محبت میں اعتبار کا ہے

یہ شہرِ خلقتِ خوابیدہ ہے یہاں شب خوں
جو مار لے وہی حقدار اقتدار کا ہے

چھپاؤ اشک اداسی کو مسکراہٹ دو
مناؤ جشن یہی حکم شہریار کا ہے

کرو ستم بھی اگر تم یہ سوچ کے کرنا
یہ کھیل وقت کا ہے اور اختیار کا ہے

محبتیں تو لبِ بام آ کے شرمندہ
عداوتوں کو بہت زعم اشتہار کا ہے

تمام روزن و در گھر کے بند کر عاصم
خیال شاہ کا سنتے ہیں پھر شکار کا ہے

○

ہے تو مانوس پہ گم گشتہ نشانی کی طرح
وہ مجھے یاد ہے بچپن کی کہانی کی طرح

آپ ساحل سے مجھے دیکھتے رہ جائیں گے
مَیں گزر جاؤں گا بہتے ہوئے پانی کی طرح

آج کے دور میں رفتار عجب وقت کی ہے
اب تو بچپن بھی گزرتا ہے جوانی کی طرح

صبر میرا بھی کسی بند کی مانند رہا
اور مزاج اُس کا بھی دریا کی روانی کی طرح

شہ کے نوکر کو اجازت ہے ستم کی عاصم
عادتیں ہو گئیں باندی کی بھی رانی کی طرح

کھلے ہوئے ہیں کئی پھول اور شجر تنہا
بہار آئی ہے اس بار کس قدر تنہا

گھرا ہوا ہے مکانوں میں ہر طرف سے مگر
ہر ایک خطرے میں ہوتا ہے میرا گھر تنہا

مرا شریک تھا وہ چاہتوں کی بازی میں
مجھے سنائی گئی ہار کی خبر تنہا

دہن دریدہ سبھی ایک ساتھ بولیں گے
رہے گی قوتِ آواز بے اثر تنہا

چرا لئے مری محرومیوں نے یار مرے
بھٹک رہا ہوں پریشان در بدر تنہا

بہار آ کے ہر اک سمت پھیل پھیل گئی
مگر ہے آج بھی اک پیڑ بے ثمر تنہا

ہر ایک جسم میں عاصم خدائی ہے موجود
ہر ایک شخص یہاں پہ ہے خود نگر تنہا

○

نہیں ہے ذہن مگر دل تمہارے دھیان میں ہے
یہ کیسی جنگ مرے اپنے درمیان میں ہے

کہاں کی راحتِ جاں منزلوں کو پالینا
مسافتوں کا مزہ جسم کی تھکان میں ہے

ہوں شہرِ یار کے آگے تو یوں لگے جیسے
ذرا ذرا سی رکاوٹ ہر اک زبان میں ہے

مرے بدن پہ بہت زخم اُس نے چھیدے ہیں
جو تیر کہنے کو اب تک تری کمان میں ہے

جو ہم کو دیتا ہے عزمِ مسافتِ صحرا
وہ اپنے آپ تو محفوظ سائبان میں ہے

یہ کس طرح کا ہے پردہ ترا کہ میرے سوا
ترا جمال ہر اک چشمِ بدگمان میں ہے

ہے ایک شہر کی تاریخ کا صلہ عاصمؔ
یہ دُکھ جو آج نمایاں مرے بیان میں ہے

پیار بھرے دن بے کل راتیں یاد نہ کر
بھول جا اُس کو اُس کی باتیں یاد نہ کر

ہر اک شخص کا نام الگ پہچان الگ ہے
صرف عقیدے، مذہب، ذاتیں یاد نہ کر

اب کی بار بھی گرمی یورپ میں گزرے گی
میٹھے آم الھڑ برساتیں یاد نہ کر

دیکھ بدن پہ دُھوپ نے کتنے زخم لگائے
تھیں کتنی مضبوط قناتیں یاد نہ کر

عاصم شب بھر خوف سے نیند نہیں آئے گی
اُس کی چالیں اُس کی گھاتیں یاد نہ کر

○

مجھے یہ بے ہنر دیوار و در اچھے نہیں لگتے
یہ مصنوعی گھرانے اور گھر اچھے نہیں لگتے

جنہیں کوئی بھی پاؤں کے تلے روندے کچل جائے
وہ خود ناآشنا خوابیدہ سر اچھے نہیں لگتے

رہِ بے فیض میں کوئی مقامِ جانفزا آتا
خدایا کم نصیبوں کے سفر اچھے نہیں لگتے

اُگے ہیں پھول جو مقروض ہاتھوں کی وساطت سے
بہت ہی خوبصورت ہیں مگر اچھے نہیں لگتے

جنہیں خود خون دے کر بیج سے دیکھا شجر ہوتے
نہ جانے کیا ہوا اُن کے ثمر اچھے نہیں لگتے

بدن کا بوجھ ہیں عاصم فضا کو چھو نہیں سکتے
یونہی تو ناتواں بیمار پر اچھے نہیں لگتے

○

بندگی میں ثواب ہیں، ہوں گے
ہم جو خانہ خراب ہیں، ہوں گے

مَیں نے کیا زندگی نہیں برتی
عشق میں سو عذاب ہیں، ہوں گے

دیکھیئے وقت نے بدلنا ہے
لوگ کچھ بے نقاب ہیں، ہوں گے

ہم نے کانٹے سجا کے رکھے ہیں
آپ کے گھر گلاب ہیں، ہوں گے

دست بستہ نہیں رہوں گا مَیں
آپ عزّت مآب ہیں، ہوں گے

ہم بہاروں کی بات کرتے ہیں
ہم اگر محوِ خواب ہیں، ہوں گے

مجھ سے منسوب حاشیے عاصمؔ
گو وہ اصلِ کتاب ہیں، ہوں گے

دیر تک بیٹھے ہوئے ساحل سے پانی دیکھنا
یوں گزرتی ہے ہماری زندگانی دیکھنا

سیپ، موتی، تتلیاں، قوسِ قزح، برکھا بہار
کچھ نہ کچھ ہر اک گھڑی اس کی نشانی دیکھنا

ہو گئے کرگس کے آگے کس طرح شاہیں نگوں
قوتِ کم حوصلہ کی ناتوانی دیکھنا

آ رہا ہے آج ملنے کے لئے مدّت کے بعد
اور سنائے گا مجھے میری کہانی دیکھنا

جن رفیقانِ جنوں نے عہدِ حق گوئی کیا
لفظ ان کے بے صدا ہیں، بے زبانی دیکھنا

آج کل اخبار کا پڑھنا بھی عاصم ہے ہنر
لفظ جو ماؤف ہیں اُن کے معانی دیکھنا

پاؤں سہلانا نہیں جسم کے آلام نہ دیکھ
ہو سفرِ دشت کا درپیش تو آرام نہ دیکھ

خود سمجھ اس کو ہے یہ فکرِ کشادہ کا شعار
تو کسی مفتیٔ کم فہم کا اسلام نہ دیکھ

اے شہہ تنگ نظر دیکھ مکاں میرا ابھی
اپنے ہی کاخ کے آسودہ در و بام نہ دیکھ

میرے حالات کو تمہید نہ دے تو اپنی
اپنے ماضی کے حوالے مرا انجام نہ دیکھ

نسل در نسل عدو ساز رہے ہیں ہم لوگ
چشمِ حیراں سے مری الفتِ ناکام نہ دیکھ

ہے سدا دائروں میں گھومتے رہنا عاصم
ایسی مشقت کے عوض منزلِ بے نام نہ دیکھ

○

کسی کے وعدے کو دل میں چھپا کے بیٹھ گئے
ہوئی جو شام تو ہم گھر سجا کے بیٹھ گئے

بس اپنے آپ کو ہی قید کر لیا ہم نے
بس اپنے گرد فصیلیں اُٹھا کے بیٹھ گئے

ابھی تو کونپلوں پہ بُور بھی نہیں آیا
ابھی سے باغ میں گُلچیں آ کے بیٹھ گئے

رہا نہیں ہے کوئی اعتماد خود پہ بھی
ہر ایک دوست کو یوں آزما کے بیٹھ گئے

یہ زندگی کی تو بازی نہیں مگر پھر بھی
محبتوں میں ہی سب کچھ لگا کے بیٹھ گئے

چمک چمک سے اُٹھے دل کے داغ کیوں عاصمؔ
یہ کیا چراغ تھے جو ہم جلا کے بیٹھ گئے

( )

نہ دھوپ ہی سے گلہ ہے نہ سائبان کا ہے
قصور یہ مرے پندار کی اُٹھان کا ہے

جہاں چھتیں ہیں وہاں میری خوابگاہ نہیں
یہ کیا عجیب سا نقشہ مرے مکان کا ہے

مرا عقیدہ فقط نیتّوں پہ مبنی ہے
بدی کا عیب نہیں ہے بدی کے دھیان کا ہے

اُگے گی کس طرح خوش فکر انقلاب کی فصل
اگر تقاضا ہر اک ذہن سے لگان کا ہے

بچے یہ رُوح جو اس بار تو غنیمت جان
کسے خیال مری جان، جسم و جان کا ہے

جو ہوتا جاتا ہے محدود حلقۂ یاراں
ترا قصور نہیں ہے تری زبان کا ہے

مکان بن گیا عاصم بس اب سجا اِس کو
حقیقتاً تو یہی وقت امتحان کا ہے

تبدیلی

گاؤں یہ کتنا پیارا تھا
چھوٹے چھوٹے
پیارے پیارے
گھر تھے اس میں
جن میں محبت ناچتی تھی
کھیت جواں سرسبز تھے سارے
باغوں میں پھل پھول بہت تھے
چھوٹا سا بازار تھا جس میں
چیز ضرورت کی ملتی تھی
ہر جانب گلیوں کوچوں میں
خوشیوں کا انبار لگا تھا
بچوں میں البیلاپن تھا
اور جواں سب چھیل چھبیلے
الھڑ تھیں ساری مٹیاریں، سب کی آنکھیں چمکیلی تھیں
اور اشکوں سے بیگانی تھیں
چہروں پہ کچھ خوف نہیں تھا
جنگ سے پہلے

○

کسی بدن سے لہو چرا کر کسی دہن پر گلال رکھنا
زبان پر امن و عافیت کا مگر مسلسل سوال رکھنا

سسکتی روحوں سے چھین لینا شکستہ جسموں کا شامیانہ
مقابلِ آفتابِ بے ابر آئینوں کا جمال رکھنا

بلند گھر کے مکین اس بار پستیوں کی دلیل ٹھہرے
انہیں نہ آیا کسی کی گرتی ہوئی نظر کا خیال رکھنا

امیرِ بے مہر کی حضوری میں سر جھکائے ہوئے کھڑے ہیں
ہمیں کو مقصود تھا اگرچہ یہاں خودی کی مثال رکھنا

تمہارے ہاتھوں کی فتنہ قوت پہ ہے مجھے اعتماد لیکن
کسی طرح بھی نہیں ہے محفوظ یوں گلابی سے گال رکھنا

مرے خدا یہ عجب کرشمہ ہے جس کو طاقت عطا ہوئی ہے
اسی کے قلب و نظر میں محفوظ بے حسی کا کمال رکھنا

یہ لوگ پانی پہ جا رہے ہیں اگانے گیہوں کی فصل عاصم
انہیں یہ سمجھاؤ تہہ میں سورج کے بھی قرینے سنبھال رکھنا

○

طفلِ معصوم کو آسودگی سے قتل نہ کر
فکرِ رنگیں کے لئے زہر کوئی فصل نہ کر

مت کھڑی کر کوئی دیوار سرِ کوئے خیال
ایک احساس ہی رہنے دے اُسے شکل نہ کر

درمیاں رہنے دے باقی یہ حجابِ رنگیں
خواہشِ لمس مری جان دمِ وصل نہ کر

مے کشی جیسی بھی آسودگی جاں ٹھہرے
مرگِ خودداری و خودرائی مگر شغل نہ کر

جبر فاسد ہے ضرورت کے سبب بھی ہو اگر
ایسا قانون کوئی ضابطۂ عدل نہ کر

وہ جو پابندِ زر و رتبہ ہوئے ہیں عاصم
اُن کی تعظیم تو جائز ہے مگر نقل نہ کر

○

جنگ کے آسیب کا ایسا اثر دیکھے گا کون
یہ دریدہ راستے ویران گھر دیکھے گا کون

خون کی تاروں میں ہر اک فاختہ کو باندھ کر
امن کی پرواز یوں بے بال و پر دیکھے گا کون

بیٹھ کر کمروں کے اندر بحث میں مشغول ہیں
ڈاکوؤں کی زد میں ہیں دیوار و در دیکھے گا کون

مجھ کو منشورِ چمن سے صرف اتنا واسطہ
پوچھتا ہے باغباں تیرا شجر دیکھے گا کون

داستانِ اُلفت خوش بخت افسانہ ہُوئی
اس زمانے میں وفاؤں کا ہنر دیکھے گا کون

اپنے اپنے خواب کی رنگینیوں میں محو ہیں
آنکھ کی دہلیز پہ رقصاں سحر دیکھے گا کون

ناخدا کم چشم ہے عالم سمندر پر سکوت
سُست رو لہروں میں پوشیدہ بھنور دیکھے گا کون

سحر کے وقت بھی ٹوٹا ہوا بدن کیوں ہو
تھی پُر سکون اگر شب تو خستہ تن کیوں ہو

اناج کیوں کسی لاغر بدن سے ہو منسوب
کسی کی بھوک مجھے لذّتِ دہن کیوں ہو

کوئی تو شہر کے معمار سے سوال کرے
ہر ایک گھر کے مقابل اُجاڑ بن کیوں ہو

فقیہہِ شہر مجھے اذنِ حق بیانی دے
کسی بھی ضابطے کے تحت میرا فن کیوں ہو

مجھے سمجھ نہیں آتا فہیمِ نقشۂ شہر
قریبِ کوچۂ گلچیں مرا چمن کیوں ہو

کسی کو شاہ سے یہ پوچھنے کی ہے جُرأت
وطن میں اپنے ہی کوئی جلا وطن کیوں ہو

خبر ہے شہر کے قانون کی انہیں عاصمؔ
کریں نہ مجھ سے تو دریافت کم سخن کیوں ہو

○

نوید موسمِ صد جانفزا نہیں لیتا
خزاں شناس پیامِ صبا نہیں لیتا

میں معتقد ہوں تجارت کا زر فروغ نہیں
کسی کی جاں کے عوض خوں بہا نہیں لیتا

عبادتوں میں بھی رکھتا ہوں عشق کا معیار
کہ نیکیوں کے عوض میں جزا نہیں لیتا

اُلٹ رہا ہے اگر دم تو یہ اُلٹ جائے
میں مستعار کسی سے ہوا نہیں لیتا

متاعِ قلب و جگر تو نے لوٹ لی پھر بھی
تری ادا سے شعورِ جفا نہیں لیتا

نہ مجھ سے ملتا ہے عاصم نہ کچھ رقیب سے ربط
وہ بدنصیب کسی کی دعا نہیں لیتا

زخمِ خزاں ہے پھول کے رنگین نکھار میں
شاید کمی رہی ہے خلوصِ بہار میں

جو خواب زندگی کے لئے دیکھتا رہا
دُھندلا گئے ہیں وقت کے اُڑتے غبار میں

ہر چند زندگی ہے بڑا کامیاب عکس
تیری کمی رہی ہے اِسی شاہکار میں

بکھرا ہوا ہے عکس تری بات بات کا
بال آگیا ہے آئینۂ اعتبار میں

اس بار سانحوں کی ادا مختلف سہی
پہلی سی بے حسی ہے مرے شہریار میں

جوہر نظر نکھار دے اس آفتاب کے
ہم بھی تو ایک عمر سے ہیں انتظار میں

سمجھا دیا ہے مجھ کو ارادوں نے ٹوٹ کر
عاصمؔ نہیں ہے کچھ بھی مرے اختیار میں

○

مَیں کتنا تنہا ہوں کوئی میری زبان سمجھے نہ بات سمجھے
نہ میرے دن کو وہ دن ہی مانے نہ رات کو میری رات سمجھے

مَیں جس کو اپنا سمجھ کے لمسِ حیات دیتا رہا خوشی سے
وہ مجھ کو مثلِ حباب مانے کرامتِ بے ثبات سمجھے

یہ سرزمیں خوشنما ہے اس میں بہت سے کوہ و دمن ہیں لیکن
کوئی ہزارہ کہے اسے کیوں کوئی اسے کیوں سوات سمجھے

میں کیسے مانوں جو درد کی مے کشید کر کے پلائے ہر پل
وہ مجھ کو ہر سانس زیست مانے اور اپنی کُل کائنات سمجھے

کسی کو کیا اب بتائیں عاصم کہ زندگی مرگِ مستقل ہے
وہاں یہ بھی سسکیاں سنی ہم نے جس کو شہرِ حیات سمجھے

○

گلہریوں کا اُسی پیڑ پہ بسیرا تھا
شکاریوں نے جسے ہر طرف سے گھیرا تھا

نہ پھل کوئی نہ کڑی دھوپ میں ملا سایہ
کبھی مری تھی زمیں بھی، شجر بھی میرا تھا

کھلی جو آنکھ تو آنکھوں میں ضو نہیں چمکی
شبِ طویل کی سرحد پہ اور اندھیرا تھا

تپش عذاب کی تھی زندگی کے صحرا میں
تمہاری زُلف کا موسم بڑا گھنیرا تھا

میں راہزن ہی کو الزام دے نہیں سکتا
جو راہ بر تھا مرا وہ بھی اک لٹیرا تھا

نہ دیکھ شہر کے ملبے کو ایسی حسرت سے
امیرِ شہر یہ سارا قصور تیرا تھا

ادائے موسمِ گُل ہاتھ آگئی عاصم
رُخِ حسین پہ سمٹا ہوا سویرا تھا

○

میرا گھر آسیب زدہ ہے اِک مدّت ویران رہا
دیکھنے ہی سے ڈر آتا ہے رہنا کب آسان رہا

میری ہر اک بے چینی کیوں تیرے نام سے اخذ نہ ہو
میرے پاگل پن کا ہر اک رنگ تمہاری پہچان رہا

ابر بھی اب کے خاصا برسا دریا بھی سیلاب ہوئے
لیکن پھر بھی کل کی صورت خشک مرا کھلیان رہا

میرے ہاتھ میں تو ہے میرے ناکردہ جرموں کی فرد
اُس کی آنکھ میں عدل کی کرنوں کا لیکن فقدان رہا

تیرے پیار کے دریاؤں کو خشک ہوئے اک عمر ہوئی
دل میں طغیانی کا پھر بھی ہر لحظہ امکان رہا

ہر اک روح کے اندر جیسے اک وحشت کا جنگل ہو
ہر اک جسم کے اوپر طاری کچھ ایسا ہذیان رہا

جسم ہر اک کمزور یہاں ہر چہرہ زرد ہوا عاصمؔ
آج کے دَور میں کس تکلیف میں زندہ ہر انساں رہا

ان کی تعریف کے کلمے بھی قصیدوں جیسے
ہیں مرے شہر کے غازی بھی شہیدوں جیسے

کیوں خوشی چند دنوں ہی کے لئے ہو مخصوص
کاش ہو جائیں سبھی دن مرے عیدوں جیسے

کربلاؤں کے عوض اِن کی حکومت قائم
مرے شاہوں کے طریقے بھی یزیدوں جیسے

کیسا محدود ہوا جاتا ہے مذہب میرا
مفتیٔ شہر کے احکام عقیدوں جیسے

ایک اک لفظ حسابِ دل و جاں ہے عاصمؔ
اس کے خط ہو گئے قرضے کی رسیدوں جیسے

○

غلط ہے صرف ہمارے بدن، ہوں پتھر سے
اگر ہے حبس تو ہر جسم سانس کو ترسے

دیئے جلائے بہت شام ہی سے جس کے لئے
ہوئی جو رات تو وہ ہی چلا گیا گھر سے

جلا کے جسم اندھیروں کا راستہ روکو
پلٹ نہ جائیں اجالے کہیں کسی ڈر سے

کھٹک رہی ہے زمانے کی آنکھ میں اب تک
وہ اک خوشی جو ملی تھی مجھے مقدر سے

کسے یہ درک ہے کیا کیا گماں گزرتا ہے
کبھی وہ آنکھ نہ جھلکے جو ادھ کھلے در سے

شناخت اپنی وہ اب کس طرح کریں عاصم
جدا رہے جو خود اپنی نظر کے محور سے

عیّاض

(مارچ ۱۹۸۸ء) فلسطین میں اسرائیلی فوجوں کے ہاتھوں نہایت بربریت سے شہید کیا گیا۔

سترہ سال کی عمر تھی ساری
خواب جواں ساون جیسے تھے
اچھا گھر ہو
اچھے کپڑے
اور اچھی تعلیم
آزادی کی سوچ رہا تھا ——
اک ظالم
مکروہ حکومت کے تھا لیکن
مدّ مقابل
ٹھوکریں، تھپیڑ، پتھر کھا کر
ہوا شہید عیّاض
لیکن اِک پیغام دیا ہے
دُنیا کے سب مظلوموں کو
ہے اِنسان آزاد
ہے اِنسان آزاد

ہائی جیک

چند دہشت پرستوں کے ہاتھوں کویت کے ہوائی جہاز کے
اغوا سے متاثر ہو کر

یہ سفر بھی کتنا عجیب ہے
کہ جو منزلیں ہیں
ہواؤں میں وہ پسِ غبار سمٹ گئیں
کہ جو حوصلے ہیں
فضاؤں میں وہ پسِ عتاب بکھر گئے
کوئی رہ شناس کہ راہبر
کہیں آس پاس نہیں رہا
کئی بے گناہ مسافروں کی ہر ایک سانس عذاب ہے
کئی بے نیاز ستمگروں کی ہر ایک سوچ خراب ہے
وہ جو راہزن ہیں
وہ کر رہے ہیں خدا کے نام پہ ہر ستم
جو گرفتِ کرب میں قید ہیں
ہے جوان اُن کی نگاہ میں بھی خدا کے نام کی روشنی

یہ جہاد کتنا عجیب ہے

کہ خدا کی فوج کے سامنے
کوئی فوج کفر کی تو نہیں
ہے خدا کے گھر میں عداوتوں کی ہر اک صلیب کھڑی ہوئی
یہ جہاد اور تو کچھ نہیں ہے مرے خیال میں خودکشی کی بڑی عجیب مثال ہے
یہ خود اپنے آپ کو لوٹنے کا بڑا اغلیظ کمال ہے
یہ جہاد اذنِ زوال ہے
یہ سفر بھی کتنا عجیب ہے
کوئی منزلیں ہیں نہ راستے
کوئی رہ شناس نہ راہ بر
نہ کوئی رفیق نہ ہمسفر
نہ خضر ہے کوئی نہ چارہ گر
ہے کدھر کا رُخ یہ نہیں خبر
سبھی راستوں میں ہے آبلوں کا شدید درد رچا ہوا
سبھی حوصلوں میں ہے بےبسی کا محیط کرب مچا ہوا
کسی اک نگاہ میں زاویوں کا کوئی کمال نہیں رہا
کسی ہاتھ میں بھی چمکنے والا کوئی ہلال نہیں رہا
کسی ایک چہرے پہ چاہتوں کا ذرا جمال نہیں رہا
وہ جو سب کی آنکھ کا نور ہے
وہ ہر ایک دل کا رقیب ہے
کوئی دوست ہے نہ حبیب ہے
یہ سفر شکستہ نصیب ہے ٭

وعدہ

جب تک مری آنکھوں میں ترکیبِ بصارت ہے
جب تک مرے کانوں کو توفیقِ سماعت ہے
جب تک ہے مرے خوں میں گردش کا ہنر باقی
جب تک مرے پیروں میں اسلوبِ مسافت ہے
جب تک مرے سینے سے سانسوں کا گزر ہوگا
جب تک بھی دھڑکنے کی اس دل میں روایت ہے
جب تک مرے ہونٹوں پہ الفاظ جواں ہوں گے
جب تک مرے ہاتھوں میں لکھنے کی نزاکت ہے
جب تک بھی مرے منہ کو حاجت ہے نوالوں کی
جب تک مرے بازو میں انصاف کی طاقت ہے

اس شہر کے لوگوں سے وعدہ ہے مرے لب پر
توقیرِ محبّت کی ہر وقت دُعا ہوگی
نفرت کے مذاہب سے کچھ ربط نہ رکھوں گا
ہر دم مری آنکھوں میں تشہیرِ وفا ہوگی
مَیں امن کی سوچوں کو تمہیدِ سخن دُوں گا
جنگوں کی پذیرائی بالکل نہ روا ہوگی

میں بھوک کی فصلوں کو پانی نہ کبھی دوں گا
قیمت کوئی غربت کی مجھ سے نہ ادا ہوگی
محتاط طریقے سے ہر فکر کو پرکھوں گا
حق گوئی سے وابستہ ہر ایک صدا ہوگی
ہاتھوں پہ اگاؤں گا کرنوں کے حسیں پودے
آنکھوں پہ اندھیرے کی ہرگز نہ ردا ہوگی
اک بندگیٔ افضل پیمانِ مسیحائی
ہر شخص کی خوش حالی مانندِ جزا ہوگی
ہر دستِ رفوگر کو پیغامِ ہنر دوں گا
ہر جسم سے وابستہ زرّیں قبا ہوگی
خالق کو کبھی اپنے جبّار نہ مانوں گا
رحمت کے حوالے سے تعریفِ خدا ہوگی

○

آنکھیں مری ہر لحظہ دیکھیں گی حسیں سپنے
انساں کی عظمت کے انسان کی حرمت کے
پُرلطف بہاروں کے خوش رنگ نظاروں کے
چاہت کی اداؤں کے خوش بخت محبّت کے
اس شہر کے لوگوں سے وعدہ ہے مرا عاصم
خوابوں کو سکھاؤں گا اطوار حقیقت کے
ہر فکرِ گریزاں کو احساس کے ناطے سے
دستور سکھاؤں گا انساں کی فضیلت کے

○

کبھی بھی مذہبِ اُلفت سے انحراف نہ کر
جواں دلوں کے عقیدوں سے اختلاف نہ کر

جو دل کی میل ہے اُس کو بھی آبِ چشم سے دھو
بدن سے لپٹی ہوئی گرد صرف صاف نہ کر

نہ دے رواج کسی جُرم حق شناسی کو
امیرِ شہر مرا ہر گُنہ مُعاف نہ کر

تجھے گِلہ ہے اگر کوئی بات کر مجھ سے
تمام شہر سے باتیں مرے خلاف نہ کر

یہ نفرتوں کے عقیدوں کا دَور ہے عاصم
محبّتوں کا سرِ عام اعتراف نہ کر

زمینِ دل کو گلستانِ آسماں دیتا
ہر ایک تخمِ محبّت کو باغباں دیتا

جو کہہ رہا ہے عبادت درونِ مسجدِ جاں
کبھی وہ کعبۂ دل میں بھی تو اذاں دیتا

نفس نفس مجھے یارب فنا کا دھڑکا ہے
کوئی تو سانس مجھے ایک جاوداں دیتا

نصابِ قلب تھا بیرونِ حلقۂ تعلیم
رسولِ عشق بھلا کیسے امتحاں دیتا

محبتّوں کی سبھی منزلیں چمک اٹھتیں
رہِ وفا میں کوئی گر متاعِ جاں دیتا

ہیں میرے شہر میں چہرے تمام بے آواز
انہیں زباں ہی نہ دی تھی تو پھر فغاں دیتا

میں اس کے واسطے عاصم شہید ہو جاتا
مگر قرار وہ اِس کو بھی رائیگاں دیتا

○

احساسِ بے صدا کو شعورِ زباں ملے
ہر سجدۂ خموش کو حرفِ اذاں ملے

ہو تیرا نام کیوں مری پہچان شہر میں
تیرے پتے سے کیوں مجھے اپنا مکاں ملے

سہمے ہوئے لبوں کی خموشی اذان ہے
بے آسرا نگاہ میں گم داستاں ملے

تم سے تو میرا چند قدم کا تھا فاصلہ
کتنے بہت سے لوگ مگر درمیاں ملے

اس کشمکش میں بیت گئی ہے تمام عمر
اپنا پتہ ملے ہمیں اپنا نشاں ملے

ایسی ہوا چلی ہے کچھ اب کے بہار میں
پھر پھول چاہتا ہے حریمِ خزاں ملے

عاصمؔ ہوئی ہے شہ کی حمایت جنہیں نصیب
وہ لوگ بھی ہمیں تو یہاں بے اماں ملے

○

امیرِ شہر کی اعلیٰ روایتیں کچھ اور
فقیہہ شہر کے لب پہ ہیں آیتیں کچھ اور

پہنچ چکے سرِ منزل تو ضابطے بدلے
سفر میں ہم کو ملی تھیں ہدایتیں کچھ اور

تو میرے ساتھ ہے لیکن خیال اوروں کا
تری وفائیں الگ ہیں حمایتیں کچھ اور

ہے اعترافِ محبّت زبان پر لیکن
تری نگاہ میں رقصاں حکایتیں کچھ اور

شہید ہو کے بھی جنّت نہیں ملی عاصمؔ
مرے خدا کو ہیں مجھ سے شکایتیں کچھ اور

بات میں سچائی تھی پھر بھی نہیں مانی گئی
ہر دلیلِ مستند میری غلط جانی گئی

شہر کی رونق میں ہے موجود وحشت کا ہنر
اس ہجومِ بیکراں سے بھی نہ ویرانی گئی

پھر وہی حالت ہے گھر کی پھر وہی کہرام ہے
رائیگاں اجداد کی ہر ایک قربانی گئی

اس طرح حالات نے بدلے ہیں میرے خال و خد
آئینے میں اپنی ہی صورت نہ پہچانی گئی

ہم نے تو سمجھا تمہارے ہر ستم کو آخری
زخم کھا کر بھی کہاں اس دل کی نادانی گئی

پھر تو ڈالے ہر طرف ہی پاسبانوں نے شگاف
جب ہمارے ہاتھ سے اس گھر کی نگرانی گئی

مچھلیوں نے ساحلوں پر کر لیا عاصم قیام
جب سمندر کے بہاؤ سے نہ طغیانی گئی

○

ہر ایک سوچ ہے بے چین جدّتوں کے لئے
زمین تنگ ہے اِنساں کی وسعتوں کے لئے

کسی نظر کو نہیں انتظار کرنوں کا
کیا گیا ہے چراغاں بھی ظلمتوں کے لئے

مَیں کس لئے کروں محدود چاہتوں کا نظام
ہے رنگ و نسل کی تفریق نفرتوں کے لئے

ہُوا ہے اب مجھے احساس وہ ضروری تھے
اُٹھا کے رکھے تھے جو کام فرصتوں کے لئے

اب ایک سانس بھی جس کے بغیر مشکل ہے
وہ ہو رہی ہے جُدا مجھ سے مدّتوں کے لئے

ہے بندگی کا فقط ایک فلسفہ عاصمؔ
روا ہے سر کا جُھکانا محبتّوں کے لئے

دو شعر

اُنہی کے بوجھ سے کیوں جسم ٹوٹ پھوٹ گیا
رہا ہوں کربِ عبادت میں جن بُتوں کے لئے

رہے خیال رفیقانِ دورِ نَو، ہو گی
نئے لہو کی ضرورت نئی رُتوں کے لئے

○

مجھے ہو رہا ہے گمان اب مری رہگزار میں کچھ نہیں
کبھی منزلیں تھیں چھپی ہوئیں مگر اب غبار میں کچھ نہیں

نہ وفا کوئی نہ جفا کوئی نہ گِلہ کوئی نہ دُعا کوئی
ترے واسطے مری بے وفا دلِ داغدار میں کچھ نہیں

کبھی فصلِ گل کی اداؤں میں ترے خزاؤں سے بھی کشید کیں
گئی جب نگاہ کی چاشنی تو رہا بہار میں کچھ نہیں

نہ صداؤں ہی میں ہے کچھ اثر نہ ہی حرکتوں میں ہیں برکتیں
ہوں میانِ شہرِ ستمگراں مرے اختیار میں کچھ نہیں

سبھی مچھلیاں تو سمندروں کی تہوں میں جا کے سمٹ گئیں
مرے تشنہ جال کو یہ گلہ کہ رہا شکار میں کچھ نہیں

نہ صدائے پا ہے کہیں کوئی نہ بدن کی باس ہواؤں میں
مجھے ہو چلا ہے یقین اب ترے انتظار میں کچھ نہیں

تجھے ایک عاصمِ بے وفا سے گِلہ کشیدہ وہی کلہ ہے
یہ تو رنج اداؤں کا دور ہے کسی اعتبار میں کچھ نہیں

○

اے وحشتِ جاں درد کے شہکار بہت ہیں
زندہ ہیں مگر لوگ یہ بیمار بہت ہیں

نفرت میں نہیں عیب محبت پہ ہے بندش
اس شہر میں اس طرز کے معیار بہت ہیں

یہ مشقِ تبسّم ہے فقط رسمِ زمانہ
شکوے تو پسِ پردۂ اظہار بہت ہیں

اِک مجھ کو ترا درد بھی منظور ہے جاناں
خوشیوں کے تری ورنہ طلبگار بہت ہیں

ویرانے میں، ہو سکتا ہے محفوظ رہیں، ہم
اِنسان کی نگری میں تو خونخوار بہت ہیں

جسموں کی تجارت تو ہمیشہ سے ہوئی ہے
روحوں کے بھی اِس دَور میں بازار بہت ہیں

معصومِ گنہ صرف گنہ گار وہیں ہیں
جس شہر میں انصاف کے دربار بہت ہیں

ٹھہرے ہوئے آنسو کئی جاگی ہوئی راتیں
عاصمؔ یہ ترے درد کے آثار بہت ہیں

○

بے ہنر نظروں میں اک صورت سجی رہ جائے گی
آنکھ ویراں راستوں کو دیکھتی رہ جائے گی

اور تو کچھ بھی نہیں ہوگا ترے جانے کے بعد
میرے اندر اک ذرا تنہائی سی رہ جائے گی

پا گریزاں، شہر کی ہر اک سڑک پر کھوں گا میں
اور بس اِک آپ کے گھر کی گلی رہ جائے گی

دست و پا بے جان ہو جائیں گے آنکھیں بے ہنر
جسم کے اندر شکستہ زندگی رہ جائے گی

اتنی گرمی میں پگھل جائیں گے سب کے سب گہر
اور دوپٹے پہ وہ قطرے ٹانکتی رہ جائے گی

کیا خبر تھی فصلِ گُل کو پھول جھڑ جائیں گے سب
اور نشانی کے لئے سوکھی کلی رہ جائے گی

روشنی پھر کس طرح عاصم ہمیں ہو گی نصیب
جب چراغوں کی ردا میں تیرگی رہ جائے گی

کوئی بھی جھگڑا کہاں مذہب کہ ایمانوں کا ہے
مسئلہ شاہوں کا ہے، اور اُونچے ایوانوں کا ہے

وہ محل لرزیں گے اِک دن یہ عقیدہ ہے مرا
جن کی بنیادوں میں خوں مظلوم اِنسانوں کا ہے

ذہن کو جچتا نہیں ہے کچھ خُداؤں کا وجود
ہر نفس اب معتقد اپنے ہی فرمانوں کا ہے

فصلِ گُل کا رنگ صحراؤں میں آئے ڈھونڈنے
کیا جنونِ جُستجوئے حُسن دیوانوں کا ہے

منجمد سوچیں ہیں ساری اور پتھر ہیں بدن
یہ ہمارا شہر ہے یا عکس بُت خانوں کا ہے

ہے مری غفلت کو بھی کچھ دخل یہ مانا مگر
گھر کے لُٹنے میں ذرا سا ہاتھ دربانوں کا ہے

ایک بس مجھ پر نہیں کرتا ہے چشمِ التفات
ورنہ عاصمؔ وہ تو اپنوں کا ہے بیگانوں کا ہے

ملال

وہ جو کل تھا وہ تو چلا گیا

یہ جو آج ہے
اِسے حُسنِ ہمت و عزم سے
تو گرفتِ شوق میں قید کر
کہیں کوئی ایسا پیامبر
کہ پیامِ عشق لطیف دے
جو ملے تو اُس کے شفیق ہاتھ کو چوم لے
کوئی روشنی کی کرن اگر
کہیں قتل ہوتی ہوئی ملے
تو سجا کے اپنی نگاہ میں
کوئی آفتاب جوان تر
اسے پھر سے طاقتِ نور دے
کہیں کوئی ایک صدائے حق
جو ہَوا کے ساتھ ہو دَر بدر

تو سماعتوں کے مکان میں
اُسے دے شعور قیام کا
جو ملے بہار کا پیرہن
کبھی تار تار خزاؤں میں
تو بفیضِ حسنِ رفوگری
سبھی چاک
پھولوں کی پتّیوں کے سنوار دے

○

وہ جو کل تھا وہ تو چلا گیا
وہ جو کل ہوا وہ غلط سہی
مگر اب ملال سے فائدہ
کہیں اِس ملال کی راہ میں
ترا آج بھی نہ تباہ ہو

میری آزادی گروی ہے

میرا گھر مرے نام ہے لیکن
مَیں نے جس سے قرضہ لے کر
اِس کے درو دیوار اُٹھائے
اُس کے ہاتھوں میں گروی ہے
میرے گھر میں اُس کا ہر قانون ہے رائج
میری رائے نہیں چلتی ہے
مَیں ڈرتا ہُوں
مَیں بولا تو
قاضی کا پیغام آئے گا
اور مجھے بے گھر کر دے گا
صرف مجھے اک اپنے گھر کا خوف نہیں ہے
شہر کا شہر ہے گروی میرا
اور وطن بھی تو گروی ہے
مَیں شہری آزاد ہُوں لیکن
میری آزادی گروی ہے

نیلسن منڈیلا ۱۹۸۸ء

○

نیلسن منڈیلا ساؤتھ افریقہ کی حکومت کی رنگ و نسل کی سیاست کے خلاف آواز اٹھانے کی پاداش میں گزشتہ چھبیس برس سے قید میں ہیں۔ یہ نظم ان کی سترہویں سالگرہ کے موقع پر تحریر کی۔

○

نیلسن تیرا عکس ہے نوری
نور بھلا کب قید ہوا ہے
تیرے جسم سے پھوٹنے والی ساری کرنیں
دُنیا بھر میں پھیل گئی ہیں
یہ چھبیس برس جو تُو نے
جہدِ مسلسل میں کاٹے ہیں
آزادی کو ناز ہے اُن پر
تُو آزاد ہے
تجھ کو قید میں بھیجنے والے
خود ہیں مقید

اپنے چھوٹے فرسودہ ذہنوں کے اندر

○

نیلسن رنگ و نسل کا یہ قانونِ شکستہ
ٹوٹ رہا ہے
وہ بھی اب لٹنے والا ہے
تیرے شہر کے لوگوں کو جو
اِک مدّت سے لوٹ رہا ہے
تیری آزادی کا سورج
پھوٹ رہا ہے ٭

ہے خوشی کا رابطہ گویا پریشانی کے ساتھ
شہر کی رونق بڑھی جاتی ہے ویرانی کے ساتھ

ناخداؤں میں ہنر لہروں سے لڑنے کا نہیں
کشتیاں بہتی چلی جائیں گی اب پانی کے ساتھ

فرطِ زر سے ہو گیا ہے شہر میں اسراف عام
ہے گرانی آج کل منڈی میں ارزانی کے ساتھ

شہر میں اس روز ہو گا عید کا اصلی سماں
سر اٹھا کر باندیاں نکلیں گی جب رانی کے ساتھ

ڈوبنے والے کو لہروں کا سہارا بھی نہیں
ایک ٹھہراؤ سا ہے دریا میں طغیانی کے ساتھ

اِن نقوشِ دین کو مذہب کی صورت ہو نصیب
رشتۂ تفہیم ہو گر فکرِ قرآنی کے ساتھ

منحرف عاصم ہوئے جاتے ہیں روحوں سے بدن
لوگ سجدے کر رہے ہیں نصف پیشانی کے ساتھ

دیکھ کس موڑ پہ لے آئی ہے چاہت اپنی
خواب لگتی ہے سراسر یہ رفاقت اپنی

مَیں جسے آپ کی تصویر سمجھ بیٹھا ہوں
وہ تو ہے صرف نگاہوں کی نزاکت اپنی

ڈوبنے والے پہ ساحل سے فقط طنز نہ کر
دیکھ دریا میں اُتر کے ذرا قامت اپنی

ہے خُدائی کا یہ انداز بھی کتنا محتاط
لوگ کرنے لگے چھُپ چھُپ کے عبادت اپنی

مجھ کو معلوم ہے اِس شہر کے لوگوں کا چلن
کس کے ہاتھوں میں رکھوں آج امانت اپنی

باغباں نے بھی شجر کاٹ دیئے ہیں سارے
اور سُورج بھی دکھائے گا تمازت اپنی

اعتماد ایسا محافظ پہ غلط ہے عاصم
لازم آتا ہے کرو آپ حفاظت اپنی

O

اَنا کی جنگ تھی جُھکنے کا تو سوال نہ تھا
وگرنہ اُس کو منانا کوئی محال نہ تھا

تمام شہر تھا نالاں مری صداقت سے
کسی نگاہ میں انصاف کا کمال نہ تھا

بنامِ عظمتِ رحمٰن بندگی کی ہے
کوئی بھی سجدہ بہ عنوانِ ذُوالجلال نہ تھا

کچھ اس لئے بھی جُدائی کا دُکھ زیادہ ہوا
مجھے گمان نہ تھا آپ کو خیال نہ تھا

ہر اک وزیر کے چہرے سے تھی عیاں تشویش
وگرنہ شاہ کو تو خدشۂ زوال نہ تھا

رہا ہے یوں تو بہت اختلاف پہلے بھی
طبیعتوں میں مگر ایسا اشتعال نہ تھا

کسی میں تھا ہی نہیں بے وفائیوں کا ہُنر
تمام شہر میں کوئی تری مثال نہ تھا

سِسکتا ڈوبتا سورج شکست خوردہ تھا
کہیں افق پہ مگر امن کا ہلال نہ تھا

شکستگیٔ مقدّر قبول ہے عاصم
غلط روی کا مگر کوئی احتمال نہ تھا

کسی کو درد کا ارمان بھی نہ ہو ایسا
مرے خُدا کوئی نادان بھی نہ ہو ایسا

کہیں میں بھُول نہ جاؤں مسافتوں کا ہنر
سفر مرا کبھی آسان بھی نہ ہو ایسا

وہ بے وفا مرا اندر سے ٹوٹ پھوٹ نہ جائے
خُدا کرے وہ پشیمان بھی نہ ہو ایسا

مَیں ہر امید کی تعزیر سے رہوں آزاد
ملے نہ وہ تو کچھ امکان بھی نہ ہو ایسا

دمِ وداع اجازت نہیں ہے رونے کی
کسی حبیب کا فرمان بھی نہ ہو ایسا

مزاج شہ کے حوالے سے جو بدلتا ہے
فقیرِ شہر کا ایمان بھی نہ ہو ایسا

مَیں اپنے نام کی پہچان ہوں کہاں عاصمؔ
کسی کہانی کا عنوان بھی نہ ہو ایسا

چُناؤ ۱۹۸۸ء

(نومبر)

ہوا ہے حکم کہ اپنا نمائندہ چُن لُوں
جو مسئلے مرے ایوانِ شاہ تک لے جائے
کرے بیان مری مشکلات حرف بہ حرف
جو گندگی مرے گھر کے قریب سے اُٹھوائے
سڑک جو آتی ہے میرے مکان تک اُس کو
بصد خلوص بڑے اہتمام سے بنوائے
وہ نالیاں جو غلاظت اُگلتی جاتی ہیں
اُنہیں ڈھکے کسی صورت سے صاف کروائے
پڑا ہے بند جو اسکول اس محلّے کا
کہے وہ شعبۂ تعلیم سے کہ کھُلوائے
کشادہ پارک جو لگتا ہے ایک جوہڑ سا
وہاں پہ جھولے سجیں پھر سے پھُول اُگوائے
روپے جو لے کے مویشی سڑک پہ چھوڑتا ہے
اُس ایک افسرِ اعلیٰ سے جان چھڑوائے
پڑے اگر کوئی بیمار درمیانِ شب
تو اُس کے پاس کوئی اِک طبیب خود آئے

کوئی بھی بھوکا نہ سوئے مرے محلّے میں
کسی کے سامنے کوئی نہ ہاتھ پھیلائے
مَیں شب میں لَوٹوں اگر دیر سے کبھی گھر کو
تو تھانے دار کوئی راہ میں نہ ٹھہرائے
بغیر رتبہ، زر بھی ملے مجھے عزّت
یہ بے اساس ہیں معیار ان کو ہٹوائے
یہ چھوٹے چھوٹے مسائل ہر اِک محلّے کے
اگر ہوں حل تو وطن پر بہار ہو جائے

○

ہُوا ہے حکم کہ اپنا نمائندہ ڈھونڈوں
مَیں چاہتا ہوں کسی ایسے شخص کو چُن لوُں
کشادہ چشم ذہین اور پُر خلوص ہو جو
بغیر خوف کے مَیں جس پہ اعتماد کروں
ہے کوئی عابد و زاہد کچھ اس سے فرق نہیں
نہیں ہے اہل اگر کوئی اس کا ساتھ نہ دُوں
شعورِ وسعتِ فکر و نظر ضروری ہے
کسی بھی حالِ فرسودہ مغز کو نہ چنُوں

○

ہُوا ہے حکم کہ اپنا نمائندہ چُن لوُں
ہُوا ہے ساتھ مگر یہ بیان بھی جاری

بڑا ضروری ہے وہ شاہ کا حمائتی ہو
ہو ذہنیت کئی پشتوں سے جس کی درباری
روا نہیں ہے کوئی پُرخلوص اہلِ نظر
روا ہیں خان خوانین، سیٹھ زرداری
ہوں بارسوخ وہ بارعب اپنے حلقے میں
کریں جو قتل شعورِ صدائے بے زاری
دیا ہے مفتیٔ اعلیٰ نے ایسا فتویٰ بھی
شعورِ وسعتِ فکر و نظر ہے بیماری
بس اتفّاق رہے شاہ کی سیاست سے
کلیدِ گنجِ حکومت عذاب و لاچاری

○

ہُوا ہے حُکم کہ اپنا نمائندہ چُنیئے
ہُوا ہے حُکم ہمیں خودکُشی روا رکھیئے

(یہ نظم جولائی ۱۹۸۸ء میں انتخاباتِ نومبر کے اعلان پر کہی گئی)

شادی/ناشادی

یہ لڑکی خوب صورت ہے
جواں ہے
نیک سیرت ہے
سلیقہ مند ہے
تعلیم بھی اس کی مکمّل ہے
زباں کی نرم، خوش اخلاق بھی ہے
یہ فرزندِ ہنر کے واسطے معقول رشتہ ہے
مگر کیجیے توقّف
ذرا رائے تو لے لیجیے
ہر اک خالہ ممانی سے
چچی سے، تائی سے، بہنوں سے، امّی کی سہیلی سے
ہوا معلوم خالہ کو پسند آئی نہیں اتنی
ذرا سی ناک موٹی ہے
قریباً چھ مہینے ہر طرح سے سوچ کر آخر
کیا ہے فیصلہ مل کر

ممانی کے محلّے میں
ہے اک لڑکی
جو ہو سکتا ہے اس لڑکی سے بہتر ہو

○

یہ کیا معیار ہیں کہئے
کسی کی زندگی سے کھیلنے کا حق ملا کیوں کر
حقارت آ رہی ہے مجھ کو ان وحشی رواجوں سے
عَلم بردار ہاتھوں سے
جو میرے شہر کی نوخیز دوشیزاؤں کو اکثر
بھری منڈی میں لا لا کر
کبھی نیلام کرتے ہیں، کبھی قربان کرتے ہیں

مرگِ بے اماں

۱۷ اگست ۱۹۸۸ء

عجب خبر ہے
مَیں سوچتا ہُوں
کہ مطمئن ہُوں
کہ غمزدہ ہُوں
وہ شخص جس نے مرے وطن کے
حسین شہروں کے
کونے کونے میں
خوف کا اہتمام کر کے
تمام سانسوں کو سخت تکلیف دہ بنایا
چلا گیا ہے
مجھے نہیں تھے پسند اس کے اصول
یہ ہے درست لیکن
مجھے یہ احساس ہو رہا ہے
کہ اُس کی اِس مرگِ بے اماں پر
مجھے بھی صدمہ بہت ہُوا ہے

اگر سیاست سے مات ہوتی اُسے
تو قصّہ الگ تھا لیکن
بہت غلط ہے
فنا کے منظر سے
اخذ کرنا جوازِ فرحت
ہے ناروا ایسی ہر سیاست
کوئی مخالف ہو یا موافق
کسی کے صدمے سے مجھ کو
ہرگز خوشی نہیں ہے